

لَا نَبِيَّ بَعْدِي (الحديث)
حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائد اعظمؒ
کی خواہش پر 1938ء سے شائع
ہونے والا ماہنامہ



ماہنامہ جون 2023ء

طلوعِ اسلام

اشاعت کا اسی واں سال لاہور

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمۡ ۖ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ (22:1)
اے نوعِ انسان! اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کی نگہداشت کرو۔ (اور اپنے معاشرہ کو صحیح
خطوط پر متشکل کر لو، اگر تم از خود ایسا نہ کرو گے تو) یہ ایک ایسے شدید انقلاب کی رُو سے واقع ہوگا
جو ہر شے کو اس کی جگہ سے ہلا دے گا۔ (مفہوم القرآن از علامہ پرویز)

اس شمارے میں:

- معاشرہ کو قرآنی نظام میں ڈھالنے کا طریقہ کار 4
- درس قرآن (سورۃ الحج، آیات 30 تا 39) 7
- نحر 23
- شرارت زندگی 25
- سوشل میڈیا اور جمعہ مبارک 37
- نظریہ مادیت انسان کی جسمانی حیوانی زندگی 40
- توحید باری تعالیٰ اور تصور آخرت 52



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پرویز صاحب کے علمی اہلوج تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ”انسان نے کیا سوچا“ اور ”اسلام کیا ہے“ ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبال کا موقف:

- 1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔
- 2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:
 - (الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔
 - (ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تشریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

- مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:
- 1- وہ روح قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔
 - 2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرز خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔
 - 3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

اس شمارے میں

ماہنامہ
طلوع اسلام
جون 2023ء
لاہور

جلد 76 شمارہ نمبر 06

صفحہ نمبر	مصنف	عنوان
4	ادارہ	لمعات: معاشرہ کو قرآنی نظام میں ڈھالنے کا طریقہ کار
7	علامہ پرویز علیہ الرحمۃ	درس قرآن (سورۃ الحج، آیات 30 تا 39)
23	لغات القرآن	ن ح ر
25	پرویز علیہ الرحمۃ	شرار زندگی
37	محمد انوار خان اسلام آباد	سوشل میڈیا اور جمعہ مبارک
40	ڈاکٹر انعام الحق اسلام آباد	نظریہ مادیت انسان کی جسمانی حیوانی زندگی
52	یوسف سیجا کراچی	توحید باری تعالیٰ اور تصویر آخرت

چیرمین: خورشید انور

مجلس ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال اور لیس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کئی اتفاق ضروری نہیں۔

زیر تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah

By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

Episode No. 17

54

ادارہ طلوع اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818

idarati@gmail.com www.facebook.com/TalueIslam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN: PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKAA02L

ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف کی جاتی ہے

اشتقاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

ناشر: عرفان راٹھور

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتہِ ایمان کی تفسیریں
براہمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چہرہ دستان! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

لمعات

معاشرہ کو قرآنی نظام ہیں ڈھالنے کا طریقہ کار

جب آپ پاکستان کے موجودہ معاشرے پر نگاہ ڈالیں گے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ اس میں کوئی خاص پرزہ خراب نہیں جس کے بدلنے سے معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی۔ یہ خرابی اس پورے نظام (Social Order) کی ہے جو یہاں کارفرما ہے۔ اس لئے ہمارے معاشرے کی اصلاح کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ یہاں موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ قرآنی نظام متشکل کیا جائے۔ قرآنی نظام کی تفصیل تو طول طویل ہیں لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی اور ان کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ”ذمہ داری“ کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے یعنی وہ نظام یہ کہہ کر فریب نہیں دے سکتا کہ ہم اس کے لئے کوشش کریں گے۔ وہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر اگر اس نظام میں کوئی ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے یا اسے سامان نشوونما میسر نہ آئے تو وہ قرآنی نظام نہیں کہلا سکے گا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار کا نظم و نسق خود اس نظام کے ہاتھوں میں ہو اور فاضلہ دولت (Surplus Money) کسی جگہ بھی جمع نہ ہونے پائے۔ یہ قرآنی نظام کی بنیادی خصوصیات ہوں گی۔ قرآن اس کے لئے جذبہ محرکہ یہ بتاتا ہے کہ انسانی ذات (انا۔ خودی۔ نفس۔ ایغو۔ Personality) کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد کسی دوسرے کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ جب انسانی ذات کی نشوونما اس طرح ہو جائے تو وہ حیات جاوید حاصل کر لیتی ہے اور اس طرح وہ مرنے کے بعد زندگی کے اگلی ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہوا مقصد۔ یعنی موجودہ نظام کی جگہ قرآنی نظام کا قیام۔ اب سوال یہ ہے کہ بحالات موجودہ اس

مقصد کے حصول کا طریقہ کیا ہوگا۔ یعنی پاکستان میں اس قسم کا نظام کس طرح قائم ہوگا؟ پاکستان ایک آئینی مملکت ہے۔ اس لئے اس میں ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام لانے کا طریق بھی آئینی ہی ہوگا۔ آئینی تبدیلی کے معنی یہ ہیں کہ ملک کی مجالس قانون ساز میں اکثریت ان لوگوں کی ہو جو اس قسم کے نظام کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملک کی ان مجالس میں (وہ مرکزی ہوں یا صوبائی) اراکین انتخاب کے ذریعہ آتے ہیں اور ان انتخابات میں آراء (Votes) کی اکثریت عوام کی ہوتی ہے۔ حالات کے اس تجزیے سے آپ نے دیکھ لیا کہ اس امر کا بنیادی اختیار عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ملک میں کس قسم کا نظام قائم کریں۔ لہذا عوام کا ان لوگوں کو مورد الزام قرار دینا جو پہلے کسی قسم کا نظام قائم کر گئے ہوں یا اپنے لیڈروں کو کو سنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ اپنے اختیارات سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

لیکن کہا یہ جائے گا کہ عوام بچارے جاہل ہیں۔ ان کا سیاسی شعور بیدار نہیں۔ وہ صحیح اور غلط نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اچھے برے نمائندے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر غریب اور مفلس ہیں کہ روٹی کا دھندا انہیں کسی دوسری طرف توجہ ہی نہیں کرنے دیتا۔ معاشی مجبوریوں نے انہیں اس قدر کچل دیا ہے کہ انہیں ملک کے آئینی اور سیاسی معاملات میں دلچسپی ہی نہیں رہی۔ نیز جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے کہ مفاد پرست گروہ اس قسم کی سازشیں اور تدبیریں کرتا رہتا ہے جن سے عوام کا شعور بیدار ہی نہ ہو۔ تو اب کیا جائے تو کیا کیا جائے؟

یہ ظاہر ہے کہ جب تک آپ کے ہاں جمہوری نظام ہے اس وقت تک عوام کے تعاون کے بغیر کوئی آئینی انقلاب رونما ہونہیں سکتا لہذا عوام میں صحیح نگاہوں کا پیدا کرنا معاشرہ کی اصلاح کے لئے لاینفک ہے۔ اس کے بغیر آپ قیامت تک بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہ کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ عوام میں صحیح نگاہ پیدا نہ ہو سکے۔ لہذا عوام میں صحیح نگاہ پیدا کرنے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے جو

(i) خود قرآنی نظام سے واقف ہوں اور اس کے قیام کے لئے مضطرب و بے قرار ہوں۔ اور

(ii) جن کے سامنے اپنا مفاد کوئی نہ ہو۔

پاکستان میں قرآنی نظام ربوبیت کی نشاندہی طلوع اسلام نے کرائی ہے۔ اس لئے وہی طبقہ اس نظام سے اچھی طرح باخبر ہے جو طلوع اسلام اور اس کے شائع کردہ لٹریچر کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار چکا ہے۔ ہمارے پاس ایسا باور (بلکہ یقین) کرنے کے لئے کافی شواہد موجود ہیں کہ ملک میں اس قسم کے حضرات کی اب کمی نہیں۔ طلوع اسلام کی کنونشن خود اس حقیقت کی زندہ شہادت تھی۔ نیز اس امر کی بھی کہ ان کے دلوں میں اس نظام کی تشکیل کے لئے بڑی تڑپ ہے اور ان کے سامنے اپنا کوئی مفاد نہیں۔ حتیٰ کہ نام اور نمود کی بھی خواہش نہیں۔ وہ ملک کے

ایسے دور دراز گوشوں میں جن کے نام تک سے بھی باہر کی دنیا کم واقف ہے، نہایت خاموشی سے اس قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں مصروف رہتے ہیں اور اس میں جس قدر تکالیف سامنے آتی ہیں انہیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ طبقہ جس پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ عوام میں ایسی صحیح نگاہ پیدا کرے کہ وہ برے اور بھلے میں تمیز کر سکیں۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ آپ پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ کو کس قدر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک کے ایک ایک فرد کو نظام ربوبیت سے آشنا کرایا جائے۔ یہ کام ذاتی بات چیت سے بھی ہوگا اور لٹریچر کی تقسیم سے بھی۔

طلوع اسلام کی طرف سے جو کچھ اس وقت تک شائع ہو چکا ہے وہ اس نظام سے متعارف کرنے کے لئے بہت کافی ہے (اس میں مزید اضافہ بھی بدستور اور مسلسل ہوتا رہتا ہے) ضرورت اس کی ہے کہ اس لٹریچر کو گھر گھر پہنچایا جائے، اس کا ترجمہ علاقائی زبانوں میں کیا جائے۔ پھر اسے ذاتی طور پر مختلف کونوں اور گوشوں میں پہنچایا جائے۔ نجی ملاقاتوں میں اس کے متعلق گفتگو کی جائے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کی دھن لگ جائے، آپ سفر میں ہوں یا حضر میں۔ اپنے مکان پر ہوں یا کسی دوسرے کے۔ شادی کی تقریب میں ہوں یا غمی کی۔ مسجد میں ہوں یا مدرسہ میں۔ آپ کسی جگہ اور کسی مقام پر ہوں، یہی نقطہ آپ کا موضوع گفتگو ہو۔

یعنی قرآنی نظام ربوبیت کا تعارف اور اس ابتدائی تعارف کے بعد جب آپ سننے والوں میں کچھ دلچسپی دیکھیں تو ان تک ضروری لٹریچر پہنچایا جائے اور اس تمام جدوجہد اور سعی و کوشش سے آپ کا ذاتی مفاد کوئی بھی پیش نظر نہ ہو۔ آپ کا قول و فعل۔ سیرت و کردار اس عظیم حقیقت کا اعلان ہو کہ:

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنَّا أَجْرِي إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (26:110)

میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف خدا کی ربوبیت عالمینی کے ذمے ہے۔

لیکن یہ کام انفرادی طور پر کما حقہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے اجتماعی اور منظم کوشش (Organised Effort) کی ضرورت ہوگی۔ ان کوششوں کا مرکز اور محور ہر شہر اور قریہ کی مقامی بزم طلوع اسلام ہوگی جو وقتاً فوقتاً مرکزی بزم سے راہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ لہذا سب سے پہلے مقدم کام ان بزموں کو زندہ، فعال، متحرک اور منظم بنانا ہے۔

آپ اپنی جگہ مل کر بیٹھئے اور سوچئے کہ اس ضمن میں آپ نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے؟؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

درس قرآن

سورۃ الحج، آیات 30 تا 39

حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِِكِيْنَ بِهِ ؕ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝۳۰ ذٰلِكَ ؕ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَابِرُ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوٰی الْقُلُوْبِ ۝۳۱ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ فَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝۳۲ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنَسَكًا لِّیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰی مَا رَزَقْنَهُمْ مِنْ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلَهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَاۤ اَسْلُبُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝۳۳ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصَّابِرِیْنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُحْسِنِیْنَ الصَّلٰوةِ ؕ وَحِیَّا رَزَقْنَهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝۳۴ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَابِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَبَرٌ ۝۳۵ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عَلَیْهَا صَوَافٍ ؕ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۳۶ لَنْ یِّنَالَ اللّٰهُ لُحُوْمَهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یِّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۳۷ اِنَّ اللّٰهَ یُدْفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝۳۸ اِذِْنِ لِلَّذِیْنَ یُقْتَلُوْنَ بِاَنۡفُسِهِمْ ظَلَمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِہُمْ لَقَدِیْرٌ ۝۳۹

عزیزانِ من! آج جنوری 1977ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 30 سے ہو رہا ہے: (22:30) پچھلے ہفتے میری طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ آج بھی ابھی تک اس کا اثر باقی ہے ہمت کر کے آتو بیٹھا ہوں اور جب تک ہمت ساتھ دے گی کچھ پیش خدمت کر سکوں گا۔ آواز پہی اثر ہے۔ بہر حال چلیے! آپ کو اپنے کانوں سے کچھ تعاون کا کام لینا ہوگا۔

حج ایک عالمگیر کانفرنس کا نام ہے:

عزیزانِ من! گزشتہ آیات میں حج کے اجتماعات کے اغراض و مقاصد اس سلسلے میں مختلف مناسک و شعائر کا ذکر آ رہا تھا اور یہی سلسلہ پیش نظر آیات میں بھی آگے چل رہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کے بعد باہمی

مشاورت کے لیے جو عالمگیر کانفرنس منعقد کی جانی تھی اس کا نام حج تھا تا کہ وہاں دلیل و حجت کی بنا پر متنازع فیہ معاملات طے کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی دیگر اقوام عالم کو بھی دعوت بھیجی جانی تھی کہ وہ آئیں اور آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ نوع انسانی کی منفعت کے لیے یہ نظام کیا کچھ کر رہا ہے۔

قرآن میں قربانی کا لفظ قربانی کے جانوروں کے لیے آیا ہی نہیں

عزیزانِ من! اب سوال یہ تھا کہ اتنا بڑا اجتماع ہو، دلیل و حجت کی بنا پر متنازع فیہ امور طے کرنے کے لیے ایک اتنی بڑی عالمگیر کانفرنس ہو تو ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہو۔ اہل مکہ تو ان کی میزبانی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہاں تو کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کھانے کے لیے اُن ہزار ہا لاکھوں کی تعداد میں باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے کیا انتظام کیا جائے تو ساتھ یہ کہہ دیا کہ یہ آنے والے اپنے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر آئیں۔ یہ تھا جنہیں یہ قربانی کے جانور کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تو قربانی کا لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا۔

ہاں یہ ضرور تھا کہ جانور ساتھ لائیں راستے میں ان سے فائدہ اٹھائیں یہاں آ کر ان کو ذبح کریں خود بھی کھائیں اور اہل مکہ کے جو محتاج ہوں، غریب ہوں، انہیں بھی ساتھ شریک کریں۔ یہ تھا مقصد۔ اسی سلسلے میں چند وہ رسومات بھی آ جاتی ہیں، جنہیں مناسک کہا جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جو گویا غور طلب بھی ہے اور وہ پھسلنی گھاٹی بھی ہے جہاں سے اقوام اکثر لغزشیں کھا جاتی ہیں۔ دین تو دنیا کی ہر قوم کی طرف آیا۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ہر زمانے میں ہر قوم میں اپنے انبیاء کو بھیجا اور یہ بھی اس نے بتایا کہ ہر نبی وہی ایک دین پیش کرتا تھا۔ دین کی اصل وہی ہوتی تھی مقامی حالات کے ماتحت ان کی شرائط میں فرق ہو جاتا تھا۔

دین قدم قدم پر نتائج کو سامنے رکھتا ہے

دین کی اصل و غایت شروع سے آخر تک ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور وہ یہی غایت تھی کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر اپنی حکومت چلائے۔ محکومیت صرف قوانین خداوندی کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں لیکن ان انبیاء کے چلے جانے کے بعد ان کا دین مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دین کی غرض و غایت اور روح تو ختم ہو جاتی تھی اور وہ بے جان رسومات باقی رہ جاتی ہیں۔ دین میں ہر موقع پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے یا نہیں جس کے لیے ان چیزوں کو تجویز کیا گیا تھا۔ ہر مقام پر سوچنا ہوتا ہے، جائزہ لینا ہوتا ہے، پرکھنا ہوتا ہے، اس کا امتحان کرنا ہوتا ہے، نتائج سے اپنے اعمال کے صحیح اور غلط ہونے کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔ یہ سوچ، فکر، تدبیر، غور، توجہ، ذہنی حرکت ہے اور ویسے بھی زندگی تو حرکت کا نام ہے۔ اس حرکت کے بغیر زندگی جو ہڑبن کر رہ جاتی ہے۔

مذہب میں جمود ہوتا ہے دین سراپا حرکت کا نام ہے

عزیزانِ من! دین یکسر حرکت چاہتا ہے، ارتقا چاہتا ہے آگے بڑھنا سکھاتا ہے۔ کسی مقام پر ذہنی طور پر کھڑے ہو جانا

ہو تو یہ فکری جمود ہوتا ہے آگے بڑھنے والی قوموں کے مقابلے میں ایسی قومیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ مذہب میں یہ حرکت ختم ہو جاتی ہے ذہنی جمود طاری ہوتا ہے تو سوچنا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ کچھ کیوں کیا جاتا ہے؟ اس لیے کہ ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کرنے والے کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ وہ کیوں کا جواب نہیں دیتا۔ کیوں کا جواب یہی ہوتا ہے کہ یہ یا تو شریعت کا حکم ہے یا یہ طریقہ اسلاف سے ذہنی جمود کے ساتھ ہی ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے۔ یہ جو دین کے مختلف عناصر ہوتے ہیں وہ مذہب کی رسومات بن جاتے ہیں۔ ہر بات کو رسمی طور پر ادا کیا جاتا ہے اور چونکہ انسان کچھ نہ کچھ تو چاہتا ہے کہ تسکین ہو کہ میں کیوں کرتا ہوں اس کیوں کے لیے ایک لفظ دیدیا جاتا ہے کہ اس سے ”ثواب“ ہوتا ہے۔ اس سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ یکسر جمود ہوتا ہے: ذہنی جمود فکری جمود زندگی کی ارتقائی منازل میں جمود اور سکوت۔ اس کا نام مذہب ہوتا ہے۔ مختلف قوموں کے اندر بھی جب دین ہوتا تھا تو اس قسم کے اجتماعات ہوتے تھے۔ جب وہ مذہب بن گیا وہی چیز یا ترا¹ ہو گئی۔ ہر مذہب میں اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے خواہ وہ گردوارہ² میں ہو خواہ وہ کسی دوسری جگہ ہو اور خواہ وہ یروشلم میں ہو۔ Pilgrimage کا لفظ یا ترا کا لفظ یہ سارے دین کی اس اجتماعی مشاورتی کانفرنسوں کی جگہ رسمی یا ترا کی چیزیں بن جاتی ہیں۔ اس کے لیے یہ الفاظ استعمال میں آ جاتے ہیں: وہاں اکٹھا ہونا، اکٹھے ہو کے چند رسموں کا ادا کر لینا، یہی مقصود رہ جاتا ہے۔ ان کی ادائیگی سے اپنا اطمینان حاصل کر لیا جاتا ہے کہ اس سے ثواب ہو جاتا ہے۔ دین یہ نہیں کہتا۔

جسمانی حرکات و سکنات کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے

عزیزانِ من! ایک چیز نہایت ضروری ہے۔ کہیں کوئی اجتماع ہو کسی معاملے پر غور و خوض ہو اس میں بعض چیزیں محسوسات کے طور پر تو کرنی ہوتی ہیں۔ ان کی ادائیگی میں انسان کا اطمینان ہی نہیں کچھ اندر کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں کئی دفعہ اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ ایک مقرر کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے وہ تو زبان سے الفاظ کی رو سے کہتا ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے جسم کی حرکات و سکنات اس کا کیسے ساتھ دیتی ہیں۔ اگر اسے روک دیا جائے کہ کسی قسم کی کوئی جنبش، کوئی حرکت، سرزد نہ ہونے پائے تو وہ پانچ منٹ تک تقریر نہیں کر سکتا اور کرتا ہے تو غیر مؤثر ہو کے رہ جاتی ہے۔ جسم کا جو بھی تقاضا ہو یا دل کا کوئی بھی تقاضا ہو اگر کسی طرح سے بھی اس کی بظاہر نمود ہوتی ہے تو وہ جسم کی کسی حرکت کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ ایک بڑی گہری نفسیاتی کیفیت ہے۔ یہ نفسیات میں یا فلسفے میں ایک خاص Subject یعنی مضمون ہے۔ دل کا تقاضا اور جسم کی حرکت متوازی چلتی ہے۔ دل کا تقاضا انسان کی آرزو یا خواہش اور اس کے اظہار کے لیے محسوس حرکات میں متوازنیت ہوتی ہے۔ کسی کی تعظیم کے لیے آپ کے دل سے جذبہ ابھرتا ہے تو بے اختیار ہاتھ ماتھے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ غصے میں آپ کے چہرے کے اعصاب کچھ اور ہوتے ہیں خوشی کا اظہار ہو تو کچھ اور انداز ہوتا ہے۔ خطرے کی آواز کان میں آئے تو تڑپ کے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ عجیب چیز ہے کہ انسان کی دلی آرزو یا خواہش یا ارادہ یا تقاضا کی نمود جسم کی کسی نہ کسی حرکت سے ہوتی ہے۔ یہ جو انسان کا اندرونی

① مقدس مقامات کی زیارت مذہبی سفر جاترا مقدس مقامات کی زیارت کے لیے سفر۔

② سکھوں کا دھرم شالہ

تقاضا ہے، محسوسات کے اندر اس کی نمود حرکت کے ساتھ ہوتی ہے۔ دین میں اس کی بھی رعایت رکھی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے طواف تھا، راتوں کو پہرہ دینے والوں کو الطائف^① کہتے ہیں اور اس امت کا فریضہ یہ بتایا تھا کہ شُہَدَاءَ عَلٰی النَّاسِ (2:143)۔ یہ نوعِ انسانی کی نگہبانی اور نگرانی کرے گی۔ نگرانی اور نگہبانی بڑے پیمانے پہ کرنے کی ایک چیز ہے کیونکہ ان کے نظام کا ایک مقصد انسانیت کی حفاظت، اس کی نگہبانی، اس کی نگرانی ہوگا تو اس مقصد کے لیے وہی ایک لفظ ”گھومنا“ ہے جس کے لیے طائف^① کا لفظ ہے۔ یہ کعبے میں محسوسات کے طور پہ ہے جسے آپ مناسک کہتے ہیں۔ آپ آج اسے رسم کہتے ہیں۔ یہ اس انداز کی چیز ہوتی ہے۔ نماز میں بھی آپ کے ہاں قیام ہے، رکوع ہے، سجود ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ یہ ایک مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ وہ جودل کے اندر خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے کی ایک آرزو اٹھتی ہے تو جھکنے کے ساتھ ہی سر جھک جاتا ہے، جسم جھک جاتا ہے۔ ہمارے ہاں آج بھی سر تسلیم خم کرنا الفاظ ہیں۔ سر خم کیا جاتا ہے۔ تسلیم کرتے وقت بھی آپ سر خم کرتے ہیں۔ تو یہ جتنی محسوس حرکات ہوتی ہیں وہ انسان کی غیر محسوس آرزوؤں کا، خواہشات اور تقاضاؤں کی نمود کا ذریعہ بنتی ہیں لیکن یہاں بھی ہم پھر انہی رسوم پہ آگئے۔ آج وہ آرزوئیں اور وہ خواہشات تو نہ رہیں اور ان کے اظہار کے لیے جو محسوس علامات تھیں وہ باقی رہ گئیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ مذہب ہو جاتا ہے۔ پھر انہیں رسم کے طور پر ادا کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ رسم ہی باقی رہ جاتی ہے۔ ان رسومات کی ادائیگی کے لیے تو وقت پیسہ، توانائی، سب صرف ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اُولَئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهِ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (18:105)۔ ان کی تمام تگ و دوراں گال جاتی ہے۔ یہ اعمال تو ہوتے ہیں مگر یہ ہوتے بے نتیجہ ہیں۔ ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وِزْرًا (18:105)۔ یومِ حساب ان کے لیے میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی کہ تول کے دیکھ تو لیں کہ وہ کتنا ہے۔ جو کوئی جنس کا سد بیچنے کے لیے منڈی میں لے آئے تو کون اسے تولتا ہے۔ کچھ تھوڑی سی ناقص ہو، تو اس کو تو پھر بھی کوئی دیکھ لے گا کہ ٹھیک ہے جی، سو فیصد نہیں، پچاس فیصد ہی سہی۔ پیمانہ ہی یہ ہے: ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ ④ (101:6)۔ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ ⑤ (101:8)۔ قرآن نے کہا ہے کہ کچھ نہ کچھ تو اس جنس میں ہونا چاہیے اور اگر وہ دیکھنے میں ہی جنس کا سد نظر آتی ہے تو کسی نے بھی اس کے لیے میزان نہیں کھڑی کرنی، تو یہ جو مذہب میں رسومات بن جاتی ہیں یہی چیزیں ہواءِ اعمال ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (18:105)۔ ان کی تمام تگ و دوراں گال جاتی ہے۔ ان کے تمام اعمال بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ غور کیجیے! یہاں لفظ اعمال ہے۔ وہ عمل تو کرے یعنی کیوں کہ وہاں بے عملی نہیں ہوتی۔ یہ قوم کام کرتی ہے لیکن بے نتیجہ کام کرتی ہے۔ اسی لیے یہ خسر الدنیا والا خرة کہا ہے یعنی یہاں بھی نقصان ہوتا ہے آخرت میں بھی نقصان ہوتا ہے۔ کیا ان رسومات کی ادائیگی میں تھوڑا نقصان ہوتا ہے؟ نہیں، بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔

① تاج العروس میں ”طوف“ کے مادے کے تحت لکھا ہے کہ الطائف۔ چوکیدار یا کوتوال جو رات کو حفاظت کے لیے پہرہ دے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ یہ لفظ واحد ہے لیکن جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ محیط الحیط میں لکھا ہے کہ طَافٌ، اسْتَطَافٌ، تَطَوَّفَ، طَوَّفَ کسی چیز کے گرد بکثرت چلنے کو کہتے ہیں۔ اور الطواف ایسا خادم ہے جو نہایت نرمی اور عنایت سے خدمت کرے۔

حج کی تمام حرمت اور شعائر اللہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں

عزیزانِ من! قرآن کریم میں ان امور کے متعلق جنہیں ہم بظاہر رسومات کہتے ہیں، غرض و غایت بتائی ہے۔ کہیں انہیں حُرْمَتِ اللہ کہا، کہیں شعائر اللہ کہا، یعنی اللہ کے متعین کیے ہوئے مقصد کی محسوس علامات۔ ان کے لیے تو لفظ ہی علامات آیا ہے، شعائر ہے Symbols (علامات) ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اگر یہ سلطنت باقی نہ رہے، صرف آپ کا جھنڈا الہر اتار رہے تو وہ جھنڈا ایک بانس اور چھوٹے سے کپڑے کا نام رہ جاتا ہے۔ زندہ سلطنت کے جھنڈے کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ چیزیں Symbols (علامات) ہوتی ہیں۔ ان آیات میں پیچھے سے یہی کچھ چلا آ رہا تھا۔ کہا کہ ذَلِکَ (22:30)۔ یہ ہے مقصد اس اجتماع کا۔ یہ چیزیں ہیں جو ہم نے اس طرح سے بیان کی ہیں۔

پھر کہا کہ وَمَنْ یُعَظِّمِ حُرْمَتِ اللہ فَهُوَ خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ (22:30)۔ سو جو شخص بھی خدا کی مقرر کردہ پابندیوں کا احترام اور ان کی عظمت کا اعتراف کرے تو یہ چیز قانونِ خداوندی کی رو سے اس کے لیے بڑی نفع بخش ہوگی۔ اس لیے ہم نے ان چیزوں کی تعظیم کا کہا ہے۔ یہ ایسے ہی باعثِ حرمت و تعظیم ہیں جیسے کہ جھنڈے کی تعظیم کی جاتی ہے اسے بھی سلامی دی جاتی ہے اس کپڑے اور بانس کو سلامی نہیں دی جاتی، اس مملکت کو سلامی دی جاتی ہے اس کی شان و شوکت کو سلامی دی جاتی ہے جس کا Symbol (علامت) یہ جھنڈا ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ حُرْمَتِ اللہ ہیں، فی ذاتہ واجب التحريم نہیں ہیں۔ یہ حرمت اللہ یعنی خدا کے مقرر کردہ مقصد کی نشانیاں ہیں۔ اس لیے محسوس طور پر جو ان نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے درحقیقت وہ خدا کے اس مقصد کی تعظیم کرتا ہے۔ اسے یاد رکھو، یہ بار بار کہا گیا ہے۔

عزیزانِ من! بات پیچھے سے چلی آئی تھی کہ یہ موسیٰ جانور اور یہ اونٹ اس عالمگیر اجتماع میں شمولیت کے وقت ساتھ لاؤ اور یہاں آ کے ان کو ذبح کرو۔ کھاؤ پیو۔ ہر مذہب میں، بتوں کے آستانوں پر مقدس مقامات پر جانوروں کا ذبح کرنا بھی چلا آ رہا ہے۔ اب یہاں بھی اس قسم کے اجتماع کے لیے کھانے پینے کا سامان دیا۔

بار بار اس کو دہرایا کہ کہیں اسے مقصود بالذات نہ سمجھ لینا کہ یہ جو قربانی دی جاتی ہے اس قربانی سے دیوتا راضی ہو جاتے ہیں، ان کی خوشنودی کے لیے یہ کچھ کیا جاتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ نہیں اُحِلَّتْ لَکُمْ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُثْلٰی عَلَیْکُمْ (22:30)۔ ہم نے تمہارے لیے سب موسیٰ حلال قرار دیئے ہیں۔ بجز ان کے جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے اور جو حرام قرار دیئے گئے ہیں یعنی وہی خنزیر، مردار، بہتا ہوا لہو اور ہر وہ چیز جو خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے۔ دیکھا، جب دین مذہب بتا رہا ہے تو وہ جو تین¹ محسوس چیزیں تھیں وہ تو آج بھی مسلمان انہیں حرام سمجھتا ہے: خنزیر، کو لہو، کو مردار کو۔ اور یہ جو چوتھی چیز تھی اس کا تعلق انسان کے قلب سے تھا یعنی ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے، وہ ساری چیزیں حرام ہیں لیکن آج بھی انسان اسے مقدس بنائے ہوئے ہے۔ اس میں ایک خاص تعظیم رکھی ہوئی ہے۔

¹ خنزیر، مردار اور بہتا ہوا لہو۔

غیر اللہ کے نام پر منسوب کردہ نیاز کو قرآن بہ نص صریح حرام قرار دیتا ہے عزیزانِ من! ان تین حرام قرار دی گئی (خنزیر، لہو، مردار) کے بعد یہ چوتھی ہے اس کا ذکر قرآن میں ہر جگہ کیا گیا ہے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں یہی نہیں کہ غیر اللہ کی طرف منسوب کی ہوئی نذر نیاز جائز ہی ہو، یہ مقدس ہوتی ہے۔ یہ جو نیاز کا دانہ یا نیاز کی جو چیزیں ہوتی ہیں ان میں ایک خاص تعظیم آ جاتی ہے، جنہیں قرآن بہ نص صریح حرام قرار دیتا ہے۔ مگر یہاں آج وہ مقدس بن جاتی ہیں۔ کہا بجز ان کے کہ جن کے متعلق ہم نے پہلے کہہ دیا ہے کہ یہ جانور تمہارے لیے حلال ہیں ٹھیک ہے، یہاں انہیں کو ذبح کرو، اتنا بڑا اجتماع ہے، یہ ان کے کھانے کا سامان ہے۔ یہ کچھ کرو۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ کھانے پینے کی چیزوں کی پابندی کی احتیاط کر لی تو دین کا مقصد پورا ہو گیا۔ اس کے لیے ایک اور چیز بھی ضرور ہے۔ عزیزانِ من! بظاہر یہ چیز بہت بے جوڑ اور بے ربط نظر آتی ہے۔ ملا بھی کہتا ہے کہ قرآن تو یہ یونہی لے آیا: اس کے بعد یہ کہہ دیا، اور اس کے بعد یہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اس قسم کی محسوس چیزوں کے ساتھ ہی توجہ ادھر دلا دی کہ دیکھنا، یہ دین کہیں مذہب نہ بن جائے۔ سنئے عزیزانِ من! کہا کہ یہ جانور حلال ہیں، ان کو ذبح کرو، خود بھی کھاؤ، یہاں کے لوگوں کو بھی کھلاؤ، لیکن ضروری ہے کہ **فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (22:30)**۔ ہر اس شے سے بچو جو زندگی کی حرکت کو ساکن کر دینے والی ہو جس سے ذہن میں جمود و تعطل طاری ہو جائے اور قوتِ عمل ساقط ہو جائے..... بت پرستی اس کی محسوس شکل ہے..... جب زندگی میں حرکت نہ رہے تو پھر اس کے ہر گوشے میں کثافتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کی صلاحیتوں کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ زندگی حرکتِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام ہے۔

اوٹان کا مفہوم اور ہمارے تراجم: ایک گمبھیر التباس

عزیزانِ من! جب دین مذہب میں بدل گیا تو مذہب کی دنیا میں ہمارے ہاں اس آیت کے ترجمے ہوئے کہ **فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (22:30)**۔ بتوں کی ناپاکی سے بچو۔ آپ کو ہر جگہ یہ ترجمہ ملے گا۔ کسی قوم کی، کسی بھی مذہب والوں کی، کوئی کتاب لے لیجیے تو وہ قوم خواہ کتنی ہی ذلیل اور گندی کیوں نہ ہو، معاف رکھیے گا عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا ہوں کہ خواہ وہ بھنگی ہی کیوں نہ ہوں، بت انکا بھی بڑا صاف ہوتا ہے، وہ تو معبود ہوتا ہے۔ مگر یہاں اس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچو۔ اوٹان وٹن کی جمع ہے۔ بنیادی طور پر عربی زبان میں ”ہر وہ شے جو ایک مقام پہ کھڑی رہے، جمی رہے، جمود ہو، جس کی حرکت ساکن ہو جائے، اسے وٹن کہتے ہیں“ میں نے کہا تھا کہ دین کا ہر وہ زندہ متحرک عنصر وٹن میں آ کے جامد ہو جاتا ہے، اس میں حرکت نہیں رہتی۔ قرآن نے کہا کہ ان چیزوں کو رسم نہ بنا لینا کہ یہ ایک زندہ جاوید نظام کے عناصر کی بجائے مذہب کی رسوم بن جائیں کہ جن میں کوئی حرکت نہ رہے۔ جامد ہو کے رہ جائیں۔ اور ”رجس“ ہوتا ہے ”ایسا گندلا پن جس سے Confusion Create (التباس پیدا ہونا) ہوتی ہے اس میں گندلا پن آ جاتا ہے اس میں کثافت آ جاتی ہے۔“ ذہنی کثافت کے لیے بھی یہ لفظ آ جاتا ہے۔ کہا کہ ان چیزوں میں یہ نہ ہو کہ جمود پیدا ہو جائے، تعطل پیدا ہو جائے، یہ رسم بن کے رہ جائیں۔ اس

کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے ذہن میں بھی صفائی نہیں رہے گی، کثافت پیدا ہو جائے گی۔ جمود سے بچو۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔

دین جب مردہ ہو جائے تو مذہب بن جاتا ہے

عزیزانِ من! زندہ اور مردہ میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ زندہ میں حرکت کی کوئی نہ کوئی نشانی تو ہوتی ہے۔ قلب کی آخری حرکت بھی جب بند ہو جاتی ہے، تو پھر اسے مردہ کہتے ہیں۔ مردہ کسے کہتے ہیں؟ جس میں حرکت نہ رہے۔ دین جب مردہ ہوتا ہے تو مذہب بن جاتا ہے۔ اسی کو تو قرآن نے اوٹان کہا ہے، وٹن کہا ہے۔ اب بعد میں یہ لفظ بت کے لیے استعمال ہوا کیونکہ بت ایک جگہ پر جامد کھڑا ہوتا تھا۔ عرب جمود کی محسوس نشانی بت کو قرار دیتے تھے۔ انہوں نے جمود کا جو صحیح مفہوم تھا اسے تو ختم کر دیا اور بت اس کے معنی ہو گئے۔ الرِّجْسُ کے معنی کر دیئے ناپاکی۔ وہ جو ذہنی کثافت ہوتی ہے اسے ختم کر دیا اور ترجمہ ہو گیا: بتوں کی ناپاکی سے بچو۔ اس نے یہ کہا تھا کہ یاد رکھو! زندگی کا کام چلتا رہے گا، توندی رہے گی، جہاں یہ کھڑا ہو گیا، تعفن پیدا ہو جائے گا۔ بند پانی میں یہ زندگی جو ہڑ بن جائے گی۔ اس نے یہ کہا تھا کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (22:30)۔ اگر جمود طاری ہو گیا تو یاد رکھو! اس میں تعفن پیدا ہو جائے گا۔ زندگی کے اندر جمود کے تعفن سے بچو، ذہنی کثافت سے بچو۔ یہ حرکت ہی ہے کہ جس سے کثافتیں مبدل بہ لطافت ہوتی ہیں، لیکن عزیزانِ من! دو ٹکڑے ہیں۔ پہلا ٹکڑا تو یہ ہے کہ جمود سے بچو، حرکت زندگی کا نام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن ہے عزیزانِ من! یہ کہا کہ حرکت اگر بلا تعین مقصد ہو تو وہ تو بگولے کا رقص ہو جاتا ہے۔ تو کیا ہر حرکت با مقصد ہوتی ہے؟ کہا کہ نہیں۔ ادھر کہا: جمود سے بچو۔ اور پھر کہا کہ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (22:30)۔ ہر اس نظریہ سے بچو جو اسے صحیح راستہ سے ہٹا کر کسی دوسری طرف لے جانے کا موجب ہو۔ اب ہمارے لیے اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ جھوٹی بات سے بچو، بتوں کی ناپاکی سے بچو۔ اگر دیکھا جائے تو ان دونوں میں یہ کیا ربط ہے؟ دین کس قسم کی حرکت چاہتا ہے؟ اس کے لیے ایک نصب العین متعین کیا۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے ناک کی سیدھ چل پڑے۔ یہ ہے وہ حرکت جو آپ کو منزل مقصود تک پہنچائے گی۔ اس کے لیے تو کہا کہ جمود سے بچو، ایک مقام پہ کھڑے ہو جاؤ گے تو ہزار سال تک کھڑے رہو گے، تم ایک قدم بھی اپنی منزل کی طرف آگے نہیں بڑھا سکو گے۔ اس لیے اس نصب العین کے مطابق اپنی زندگی میں حرکت رکھو! اس میں جمود نہ آنے دو۔

نصب العین سے دُور لے جانے والی حرکت سے بھی بچو اور جمود سے بھی

عزیزانِ من! زندگی میں حرکت ضروری ہے لیکن حرکت کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یاد رکھو ”زور“ نہیں۔ زور کے معنی ہوتا ہے ”کسی جگہ سے ٹکرا کے دوسری طرف نکل جانا“۔ اس لیے کہا کہ اس حرکت میں یہ نہ ہو کہ جو تمہارے ہاں کی خود ساختہ

① اَلْاَزْوَرُ۔ وہ جس کے سینے میں ٹیڑھا پن ہو نیز نکلیوں سے دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے اس لفظ کے معنی ایک طرف جھک جانے کے آتے ہیں۔ نیز سیدھے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہوجانے کے۔ ابن فارس نے اپنی کتاب مقابیس اللغات میں اس کے بنیادی معنی ”کسی طرف جھک جانے اور ایک طرف جانے“ کے لکھے ہیں۔ تاج العروس، محیط الحیط اور مقابیس اللغات میں لکھا ہے کہ زَوَّرَ عَنَهُ کے معنی ہیں ”وہ ایک طرف ہٹ گیا“۔ اسی سے اَلْاَزْوَرُ جھوٹ کو کہتے ہیں۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد دوم میں لکھا ہے کہ انسان کا ہر وہ قدم جو صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا پڑے زور میں آئے گا۔ (ص 823)

منزل مقصود ہے تم وہاں جا پہنچو۔ یا اس حرکت کا تعین ہی نہ کرو کہ وہ تمہیں منزل مقصود تک لے جائے۔ اور اگر متعین بھی کرو تو اس طرف نہ جاؤ جدھر جی چاہے نکل جاؤ۔ جمود سے بچو اور اس حرکت سے بھی بچو کہ جو تمہیں نصب العین کی طرف نہ لے جائے کسی اور طرف لے جا رہی ہو۔ اللہ اکبر! غور فرما رہے ہیں عزیزانِ من! اور پھر قرآن ہے اگلی ہی آیت کے پہلے ہی دو لفظوں میں بات واضح کی۔ کہا کہ زندگی میں حرکت بڑی ضروری ہے۔ چلو ضرور چلو مگر یوں نہ چلو کہ نصب العین کی طرف سے ادھر ادھر رخ کر کے کوئی ادھر مڑ گیا کوئی ادھر مڑ گیا: حُنَفَاءَ لِلّٰہِ (22:31)۔ صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ انسان ہر طرف سے خیال ہٹا کر اپنی توجیہات کا مرکز قوانینِ خداوندی کی اطاعت کو قرار دے۔ یہاں حُنَفَاءَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ”ناک کی سیدھ چلے جانے“ کے ہوتے ہیں۔ اللہ کے مقرر کیے ہوئے نصب العین کی طرف ناک کی سیدھ چلے جاؤ۔ اور اس سلسلے میں فَاجْتَنِبُوا الزَّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (22:30)۔ جمود سے بچ جاؤ۔ ساکن ہونے سے بچ جاؤ۔ حنفا چلو۔ زور سے بچ جاؤ۔ نہ ادھر نکلو نہ ادھر نکلو۔ چلو اوثان کی اذیت سے بچ جاؤ۔ حنفا بھی کس طرح سے؟ وہ جو خدا نے خود کوئی مقصد متعین کر دیا اس کی طرف سیدھے چلے جائیں۔ یہ ہے مقصد۔ لِلّٰہِ (22:31)۔ خدا کے مقرر کردہ نصب العین کی طرف۔ مزید اس کی وضاحت کر دی کہ غَیْبٌ مُّشْرِکَیْنِ بہ (22:31)۔ اس میں کسی اور کی محکومیت کو شامل نہ کرو۔ یہی نہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کا متعین کیا ہو یا اپنا متعین کیا ہو مقصد ہو بلکہ اس میں بھی کسی اور کی شرکت نہ ہو کہ کچھ اس کا ہو اور کچھ اس کا ہو۔ اس نصب العین میں تو ذرا سی بھی کوئی دوسری چیز ملا دی جائے تو پھر عزیزانِ من! یہ گدلا ہو جاتا ہے تو حید خالص باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے کہا کہ حُنَفَاءَ لِلّٰہِ غَیْبٌ مُّشْرِکَیْنِ بہ (22:31)۔ صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ انسان ہر طرف سے خیال ہٹا کر اپنی تمام توجیہات کا مرکز قوانینِ خداوندی کی اطاعت کو قرار دے اور اس میں کسی اور کی محکومیت کو شامل نہ کرے۔ یعنی عام زبان میں کہ شرک نہیں کرو۔ شرک کے متعلق ہمارے ذہنوں میں یہی ہے کہ بتوں کے سامنے جھکنے کا نام شرک ہے۔ بس یہ جو ہزار بت اپنے ذہنوں میں رہائش پذیر ہیں ان کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ قرآن کریم میں آپ دیکھیے کہ شرک کس قدر ایک مانع چیز ہے۔ لہذا یہ سوچے تو سہی کہ یہ شرک ظلمِ عظیم ہے۔ قرآن نے تو اس کی اتنی زیادہ شدت سے مخالفت کی ہے کہ کچھ یوں نظر آتا ہے کہ وہ ہماری زبان میں جسے کہتے ہیں کہ اللہ میاں اس غلط عمل کو تو دیکھ ہی نہیں سکتا جبکہ عزیزانِ من! اگر آپ ہر انسان کو رب بنالیں گے تو اس کی ربوبیت میں تو کچھ فرق ہی نہیں آتا۔ وہ تو اس وقت بھی رب اور اللہ تھا جب تم میں سے دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا اور اس وقت بھی وہ اسی طرح سے رہے گا حتیٰ کہ دنیا میں کوئی بھی نہیں رہے گا۔ مگر ساری دنیا اسے اللہ ماننے لگ جائے تو بھی اس کی الوہیت کے اندر کوئی فرق نہیں پڑتا یا ساری دنیا اس کی ہستی کا انکار کر دے تو بھی اس کو کچھ فرق نہیں فَإِنَّ اللّٰہَ غَیْبٌ عَنِ الْعَالَمِیْنَ (3:97)۔ خدا تو تمام سے بے نیاز ہے خدا کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

ذاتِ خداوندی ہر چیز سے مستغنی ہے

عزیزانِ من! خدا مستغنی ہے لہذا وہ جو شرک کی اتنی مخالفت کر رہا ہے تو اس لیے نہیں ہے کہ اس سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ یہ

اس لیے ہے کہ اس سے انسان کا کچھ نہیں بچتا۔ اسی لیے اسے ظلمِ عظیم کہا ہے۔ ظلم کے معنی ہوتا ہے ”جس شے کو جس مقام پہ ٹھیک ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو“۔ کہا کہ تم نے سوچا بھی ہے کہ مقامِ انسانیت کیا ہے؟ یہ تمام کائناتِ اشیائے کائنات اور فطرت کی قوتیں جسے اس نے ملائکہ کہا ہے، یہ تو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ تو مقامِ آدم کائنات کی تمام اشیاء سے بلند ہے اور یہ قوتیں یوں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوئی ہیں اور یہ ان کے مقابلے میں بلند ہوا تو اس کا صحیح مقام یہ ہوا۔ اگر یہ اشیائے کائنات میں سے کسی کے سامنے جھک گیا تو ظلم ہو گیا۔ اسے اسی مقام پہ رہنا چاہیے تھا۔ وہ اس مقام پہ نہ رہا، انسان نے اپنا صحیح مقام چھوڑ دیا۔ تمام انسانوں کو قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17:70)۔ ہر ابنِ آدم یکساں طور پہ واجب التکریم ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے جھک گیا تو پھر بھی اس نے اپنا مقام چھوڑ دیا۔ لہذا دیکھا جائے تو یہی دو ہی عناصر ہو سکتے ہیں جن کے سامنے انسان جھکے گا: یا کائناتی قوتوں کے سامنے جیسے کہ دنیا میں آپ نے دیکھا یہ ہندوؤں کے دیوی اور دیوتا اور یہ سارا اصنامیات یا دوسرے انسان کے سامنے جھکا جو انسانوں کی دنیا میں ہوتا چلا آ رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے انسان اپنے مقام سے نیچے گر گیا۔ شرک انسان کو اس کے اپنے مقام سے گرا کر اس کی تذلیل کا باعث بنتا ہے۔

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا، نہ من ①

عزیزانِ من! شرک وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ دین کا مقصد اور غایت انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرانا اور اس پر قائم رکھنا ہے۔ جب بھی یہ اپنے مقام سے گرا اس کے لیے وجہ ذلت ہو۔ اسی کا نام شرک ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جھکنا صرف اس کے قانون کے سامنے چاہیے۔ انسان سے بڑی نہ تو کائنات کی کوئی قوت ہوئی، نہ کوئی دوسرا انسان ہے۔ ایک ہی ہستی باقی رہ گئی جسے خدا کہا جاتا ہے۔ لہذا خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے سے انسان کی تذلیل نہیں ہوتی کہ یہ سب سے بڑا (اکبر) ہے جس کے سامنے یہ جھکا البتہ اس کے علاوہ جب دوسرے انسان کے سامنے جھکا تو اپنے جیسے کے سامنے جھکا اور اگر وہ فطرت کی قوتوں میں سے کسی کے سامنے جھکا تو پھر تو وہ قوتیں جو اس کے اپنے سامنے سجدہ کرنے والی تھیں یہ ان کے سامنے سجدہ کرنے لگ گیا تو یہ ہے شرک۔ سنئے کہ اس سلسلہ میں قرآن کیا کہتا ہے؟ کہا کہ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ (22:31)۔ یاد رکھو! جو شخص خدا کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے سامنے جھکتا ہے اس طرح وہ خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ اب خدا کے ساتھ شرک کے معنی آپ نے سمجھ لیے کہ جب انسان اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکتا ہے تو یہ شرک ہوتا ہے۔ کہا کہ اس سے یوں سمجھیے اور یوں دیکھیے کہ قرآن انسان کو کیسے سمجھا رہا ہے۔ اس طرح جھکنے کے بارے میں یوں سمجھیے کہ جیسے خَرَّ مِنْ السَّمَاءِ (22:31)۔ انسان آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آگرا۔ خدا نے اسے اپنے مقام سے نہیں گرایا بلکہ انسان نے ہی اپنے آپ کو یوں پامال کر لیا ہے۔ لہذا جب یہ یوں گر گیا تو کیفیت اس کی کیا ہوگئی؟ کیا بات ہے! عزیزانِ من! کہا

کہ فَتَخْطِفُهُ الظُّلُمُ (22:31)۔ جیسے (چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے زمین پر گر جائے تو) اسے چیل جھپٹ کر لے جائے۔

مقامِ انسانیت سے گرے ہوئے انسان کی حالت

عزیزانِ من! یاد رکھیے کہ جب کوئی شخص خدا کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے سامنے جھکتا ہے تو وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو یوں سمجھیے کہ جیسے ایک چڑیا کا چھوٹا سا بچہ ہو اور وہ اپنے گھونسلے سے گر جائے تو قرآن کہتا ہے کہ وہ کسی کو لے یا چیل کی جھپٹ میں آئے اور پھر وہ جھپٹ کر جہاں جی چاہے اس کو لے جائے۔ یعنی انسان جب اپنے مقامِ انسانیت سے گر جائے تو پھر ہر جھپٹنے والا اس کو جھپٹ کے لے جاتا ہے۔ یہ ہے شرک اور یہاں کہا کہ اَوْ تَهْوِي بِرُءُوسِكَ فِي مَكَانٍ سَحِيحٍ (22:31)۔ یا یوں سمجھو کہ ایک سوکھے گھاس کا تنکا ہو، تیز ہوا کا ہر جھونکا جدھر جی آئے اس کو اڑائے۔ اس کا تو اپنا کوئی وزن ہی نہیں رہتا۔ اپنا کوئی مقام ہی نہیں رہتا۔ کہا کہ شرک یہ کرتا ہے کہ اسے پر کاہ کی طرح اڑائے اڑائے پھرتا ہے اور کسی دور دراز گوشے میں جا پھینکتا ہے۔

شرک انسان کو مقامِ انسانیت سے گرا دیتا ہے

عزیزانِ من! تو اب آپ نے بات سمجھ لی کہ شرک بتوں کے سامنے جھکنے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا ہے۔ یہ شرک ہے۔ خود اپنی خواہشات کے سامنے جھکنا بھی شرک ہے۔ ایک انسان کی جو اپنے مقام کو چھوڑ کر اس پستی پہ آئے گر جاتا ہے تو اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ پھر وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آگرا ہے۔ کس قدر وہ ضعیف و ناتواں ہو گیا کہ ہر صاحبِ قوت جس کا جی چاہے چھٹا مار کے لے جائے۔ اس کو ہر تیز ہوا کا جھونکا جدھر جی چاہے اڑائے پھرے۔ پھر اگلی آیت میں کہا کہ ذٰلِكَ (22:32)۔ یہ انجام ہوتا ہے غیر خداوندی قوتوں کے سامنے جھکنے کا۔ پھر کہا کہ سَوْجِ لِيْجِے بات یہ ہے کہ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (22:32)۔ (اس کے برعکس) جو شخص خالصۃً نظامِ خداوندی کی اطاعت کرے گا اور اس کے اعتراف کے طور پر اس نظام کے نشانات (Symbols) کی تعظیم کرے گا تو یہ اس امر کا اظہار ہوگا کہ اس کے دل میں تو انہیں خداوندی کی نگہداشت کا احساس اور ان کا احترام موجود ہے۔ لیکن اگر ان نشانات کی تعظیم ہی مقصود بالذات بن جائے یا یہ چیز محض رسم بن کر رہ جائے تو یہ بات انسان کو دین کی حقیقت سے دُور لے جائے گی۔ اسے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ یہ جو ہم نے شعائر کہہ دیئے ہیں ان کی تعظیم کو یہ نہ سمجھ لینا کہ تم انسان انکے سامنے جھک گئے ہو یہ وَمِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ¹ ہے۔ یہ تو تمہارے دل کے اندر جو ایک خواہش کی نمود ہوئی ہے یہ تو صرف اس کے اظہار کا ایک محسوس ذریعہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کس طرح بتاتا ہے کہ کہیں یہ دین مذہب میں نہ بدل جائے۔ کہیں یہ شعائر یہ Symbols (نشانات) مقصود بالذات نہ بن جائیں۔ یہ تَوْتَقَوَّى الْقُلُوبِ (22:32) ہے یعنی یہ تو تمہارے دلوں کے اندر تو انہیں خداوندی کے متعلق ایک احترام ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق تم نے انہیں بھی واجب الاحترام سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ بجائے خویش کسی احترام کی مستحق نہیں ہیں۔

اب قرآن کریم نے یہ کہا کہ مکے میں اس عالمگیر اجتماع کے لیے جانور لیے آرہے ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ عربوں کے ہاں یہ حج تو قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا، کعبے میں بت بھی نصب تھے ان بتوں کے ہاں قربانیاں بھی دی جاتی تھیں، ان قربانی کے جانوروں کو یہاں لایا جاتا تھا: ان جانوروں کو بھی مقدس سمجھا جاتا تھا، جیسے یہ ہندوستان والے اور جہاں جہاں بھی کسی بت کے نام پر کوئی جانور چھوڑا ہوا ہوتا ہے وہ جانور مقدس ہو جاتا تھا۔ ہاں تو یہ جو مکے میں اس عالمگیر اجتماع کے لیے تم جانور لیے آرہے ہو ان کے متعلق کہا کہ انہیں یہاں ذبح کرو، کھاؤ پیو، یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مقدس ہو گئے۔ اس سلسلے میں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سن لو کہ تم جن جانوروں کو اس اجتماع میں کھانے پینے کے لیے ذبح کرو گے ان کے متعلق یہ تصور نہ کر لینا کہ یہ بھی اسی قسم کی قربانی ہے جیسے عام پرستش گاہوں میں کی جاتی ہے اور یہ جانور مقدس ہو گئے۔ بالکل نہیں۔ یہ عام جانور ہیں لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى (22:33)۔ جن سے تم دورانِ سفر سواری یا بار برداری کے سلسلے میں مختلف فائدے اٹھاتے ہو۔ جس طرح اور جانوروں سے کام لیتے ہو اسی طرح ان سے بھی کام لو۔ وہ جانور جو بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے ہوتے تھے ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ یہاں کہا کہ ان میں کوئی چیز تقدیس کی نہیں آگئی، یہ مقدس نہیں بن گئے، ان سے کام لو ثُمَّ هَلَّاهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ (22:33)۔ انہیں یہاں (خانہ کعبہ میں) لا کر اپنی خوراک کے لیے ذبح کرو۔ بس اب ان کا کام اتنا ہی ہے کہ جب تک یہاں جمع ہو، تو ضرورت کے وقت ان کو ذبح کرو اور کھاؤ پیو۔ کہا کہ یہ جو ہم نے جانوروں کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینے کا طریق بتایا ہے تو یہ خصوصیت تمہارے لیے نہیں۔ وَلَكِنْ أُمَّةً جَعَلْنَا مَنَسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (22:34)۔ ہم نے ہر قوم کے لیے یہ طریق مقرر کر دیا تھا کہ وہ جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا کریں (22:67)۔ اب یہ چیزیں تمہیں رسم بن کے نظر آ رہی ہیں۔ مختلف مذاہب، مختلف اقوام میں درحقیقت Originally شروع ہی میں انہیں بھی یہی کچھ بتایا گیا تھا، جو آج تمہیں بتایا جا رہا ہے۔ یہ بھی دین میں اللہ ہی کا نام لینے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا۔ بعد میں انہوں نے ان چیزوں کو اپنے ہاں مذہبی رسوم میں تبدیل کر لیا۔ ہر قسم کی جہالت اور ہر قسم کا شرک اس کے اندر آ گیا۔ یاد رکھو! یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اسے کرتے وقت ایک حقیقت کو سامنے رکھو اور وہ یہ ہے کہ فَالْهُكْمُ لِلَّهِ وَالْاجْدُ (22:34)۔ صرف خدا تعالیٰ کی ہی ایک قوت ہے جس کے سامنے جھکنا ہے۔ اس سے مقصود ہی یہ ہے کہ خدا کا صحیح تصور اور نکھر ا ہوا تصور بروقت تمہارے پیش نظر رہے اور یہ حقیقت تمہاری نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے کہ تمہارے اوپر اقتدار و اختیار صرف خدا کے واحد کا ہے اور کسی کا نہیں۔ فَلَا أَسْأَلُكُمْ (22:34)۔ سو تم صرف اس کے قوانین کی اطاعت کرو۔ صرف اس کے سامنے جھکو، کسی اور میں کوئی تقدیس نہیں آ جاتی، کوئی شے وجہ تکریم نہیں بن جاتی۔ صرف اسی کے سامنے جھکو۔ یہ ہے دین کی وہ اصل جس میں کسی قسم کا تنازعہ نہیں ہو سکتا (22:67)۔ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ (22:34)۔ سو جو لوگ اس اصل عظیم کے سامنے جھک جائیں، انہیں زندگی کے خوشگوار نتائج کی بشارتیں سنا دو..... اور کھل کر کہہ دو

کہ جو لوگ ایسا کرنے والے ہیں ان کو زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دو کہ اس نچ زندگی سے کہ انسان قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ اس کا نتیجہ زندگی کی سرفرازیاں ہیں خوشگواریاں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (22:35)۔ جن کے سامنے جب قانونِ خداوندی پیش کیا جاتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کے تصور سے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں (8:2)۔ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی آتے ہیں تو ان قوانین کے سامنے جھکنے کے لیے ان کے دل کے اندر ایک نرمی پیدا ہوتی ہے اور ہر مقام پر یہ سرفرازی سے گزر جاتے ہیں کہیں بھی کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے۔ صرف مومن خدا کے حکم سے مجبور ہوتا ہے۔ جب اس کا قانون سامنے آتا ہے تو وہاں ان کا دل نرم پڑ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہاں الفاظ ہیں: وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (22:35)۔ ان کے دل میں ایک نرمی تو آتی ہے لیکن یہ نرمی اس قسم کی نہیں ہوتی کہ جس میں ’ہو جا لکھ مسیت دا۔ جیہڑا جی چاہے تار ڈا ای تریا جاوے‘ تیرے اتوں لنگدا۔‘^① یہاں کہا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰی مَا اَصَابَهُمْ (22:35)۔ اس قانون پر چلنے کی راہ میں انہیں جو جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا نہایت ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آتی۔

نظامِ خداوندی کا مقصد انسانوں کے لیے دلوں کی نرمی کے ساتھ سامانِ زیست کو عام کرنا ہے عزیزانِ من! خدا کے متعین کردہ مقصد حیات کے حصول کے لیے زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ روشِ حیات کے اس طریق پر جو بھی آفات آتی ہیں یہ لوگ نہایت استقامت سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نرمی کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ اس سے ان میں بڑی استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہوتا ہے؟ اس کے قانون کے سامنے جھکنا اور باطل کے سامنے ڈٹ کے کھڑے ہو جانا، کاہے کے لیے ہے؟ کہا کہ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ (22:35)۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے کے لیے اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُوْنَ (22:35)۔ نوعِ انسانی کے مفاد کے لیے جو بھی سامانِ زیست ہم نے دیا ہے اس کو کھلا چھوڑنے کے لیے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے کیا جائے گا۔ پھر ادھر توجہ دلائی کہ یاد رکھو! یہ جو اونٹ ساتھ لیے آرہے ہو انہیں اس اجتماع کے موقع پر ذبح کرنا ہے۔ ان کے لیے یہ یاد رکھو کہ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَائِرِ اللَّهِ لَكُمْ (22:36)۔ وہ اونٹ بھی نظامِ خداوندی کے نشانات (Symbols) میں سے ہیں۔ یاد رکھو کہ ہر وہ شے جو کسی نہ کسی طریق سے اس نظام کی اقامت اور استحکام کا موجب بنتی ہے اس کے شعائر میں شمار ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس طرح یہ جانور تمہارے لیے مقدس بن جاتے ہیں۔

اونٹ وغیرہ چڑھاوے کے نہیں بلکہ بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں

عزیزانِ من! اب یہ بھی یاد رکھو کہ یہ جو Symbols (نشانات) ہیں یہ شعائرِ اللہ ہیں، قربانی کے اونٹ نہیں ہیں، چڑھاوے

① مسجد کا نہیف و وزارت کا بن کر رہ جاؤ، جس کا جی چاہے تمہیں روندنا چلا جائے، وہ تمہیں پاؤں تلے لٹاڑتا چلا جائے اور اسے اس کی خبر تک بھی نہ ہو (کہ اس نے کیا کیا)۔

کے اونٹ نہیں ہیں۔ یہ تمہیں اس مقصد کے لیے کہا ہے کہ انہیں ساتھ لاؤ تاکہ اس عالمگیر اجتماع میں تم انہیں ذبح کر کے کھاؤ پیو۔ یہ صرف شعائر اللہ ہیں۔ Symbols (نشانات) ہیں۔ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ (22:36)۔ تمہارے فائدہ اٹھانے کی چیزیں ہیں یعنی تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ فَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ (22:36)۔ انہیں اللہ کا نام لے کر قطار در قطار ذبح کرو۔ یہ تو تمہارے تابع تسخیر ہیں۔ اس زمانے میں اونٹوں کو کھڑا کر کے ذبح کیا کرتے تھے۔ گردن میں برچھا مارتے تھے۔ لٹا کر ذبح کرنا بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ ذبح ہی ایسے کیا کرتے تھے۔ انہیں اسی طرح کہا کہ ان کو اس طرح سے ذبح کرو۔ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطِيعُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ (22:36)۔ جب وہ ذبح ہو کر کسی پہلوں پہ گر پڑیں تو ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور تکلیف زدہ اور ضرورت مندوں کو بھی کھلاؤ۔ یہ سب اس لیے ہے کہ كَذَلِكَ (22:36)۔ یہ سب ہیں ہی اس مقصد کے لیے۔ آگے پھر وہی بات آگئی کہ سَخَّرَ لَهَا لَكُمْ (22:36) انہیں ہم نے تمہارے تابع تسخیر کیا ہوا ہے۔ یہ کہیں بھی تمہارے دیوتا یا مقدس اصنام نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ کا ہے کے لیے ہے؟ کہا کہ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (22:36)۔ تاکہ تم (کھانے پینے کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے بلند مقصد کے لیے) ایسی کوششیں کرو جو بھرپور نتائج مرتب کر سکیں۔ اب ہمارے ہاں تو پھر وہی ترجمہ کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔^① یہاں کہا ہے کہ یہ سب سامانِ زیست کھانے پینے کا سامان یعنی یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ سب اس لیے ہے تاکہ مقصد کے حصول کے لیے تمہاری یہ کوششیں صحیح نتائج برآمد کر سکیں۔ شکر کے معنی ہوتا ہے بھرپور نتائج مرتب کرنا۔^② اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ جانور تمہاری ضروریات پورا کرنے کے لیے ہیں۔ یہی ان کے اس موقع پر ذبح کرنے سے مقصود ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَآؤُهَا (22:37)۔ اللہ تک ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ لہذا کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ یہ بتوں کے آستان کے اوپر لا کے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں قربانیاں کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے خون سے ان کے گوشت سے خوش ہوگا۔ نہیں بالکل نہیں۔ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ (22:37)۔ اس کے ہاں تو صرف دیکھا جاتا ہے کہ تم اس کے قوانین کی کس حد تک نگہداشت کرتے ہو اور کس طرح نگہداشت کرتے ہو۔

دود پوتاؤں کے باہمی معاملہ میں بے لطف و بے ہاتھ مجبور کی بے بسی

عزیزانِ من! خدا کو گوشت اور خون کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تو صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ تم اس کے

① محیط الحیط میں ہے کہ اَلشُّكْرُ اس مادہ کے اصل معنی بھر جانا اور اظہار کرنا ہیں۔ شَكَرَ فُلَانٌ۔ اس شخص نے دل کھول کر سخاوت کی اور لوگوں کو خوب دیا۔ صاحب تاج العروس (جناب محب الدین الزبیدی الحنفی) کے نزدیک انسان کی طرف سے شکر کے معنی اطاعت و ادائے فرائض نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار اور خدا کی طرف سے شُكْرُ کے معنی پورا پورا بدلہ دینا یا تھوڑے عمل کو بڑھا کر اجر دینا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے آپ کو تنگی میں رکھ کر دوسرے کی تھوڑی سی مدد بھی کرتا ہے تو اس کی یہ قربانی اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو اپنی ضروریات سے زائد چیز دوسرے کو دے دے۔ ”تھوڑے عمل کا زیادہ اجر دینے“ کا یہ مطلب ہے۔ شکر ایسی کوشش جس کے بھرپور نتائج سامنے آجائیں۔ ایسے بھرپور جیسے بقول صاحب تاج العروس صَرَفَ شُكْرِي بَكْرِي کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں۔

قوانین کی نگہداشت کس حد تک کرتے ہو۔ اس لیے قرآن میں بار بار آتا ہے کہ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هٰذِلْكُمْ ۚ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ (22:37)۔ سَخَّرَهَا بار بار کہا ہے۔ مذہب میں پہنچ کے چڑھاوے کے یہی جانور سائنڈھ دیوتا بن جاتے ہیں اور مقدس ہو جاتے ہیں اور پھر ان کو کوئی چھو تا تک نہیں، چھیڑتا تک نہیں۔ آپ کو یاد ہے جو میں نے سنایا تھا کہ مقدس ہونے میں مصیبت پڑ جاتی ہے۔

ہندوؤں کے ہاں سائنڈھ بھی دیوتا ہوتا ہے۔ پیپل بھی دیوتا ہوتا ہے۔ لالہ جی نے دیوتا کے درشن کرنے کے لیے کہیں جانے کی بجائے اپنے ہی ہاں ایک طرف پیپل کا چھوٹا سا پودا لگا دیا اور گھر کے نوکر کو یہ کہہ دیا کہ اس کی حفاظت رکھنا کہ کہیں کوئی جانور اس کو کھا ہی نہ جائے۔ تو ایک دن اس نے دیکھا کہ وہ ٹنڈ منڈ ہو گیا ہے۔ اس نے بہت غصے میں نوکر سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ تمہیں تو اس مقصد کے لیے تنخواہ دیتا ہوں کہ اس کی حفاظت کرو۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟ وہ کہنے لگا کہ جی! گیا تو کہیں نہیں تھا۔ تو لالہ جی کہنے لگے کہ پھر یہ سب کچھ تیرے سامنے ہوا اور تو دیکھتا رہا۔ وہ کہنے لگا کہ جی! کیا کرتا! ادھر سے سائنڈھ دیوتا جی آئے انہوں نے آ کے اسے منہ مارا۔ اور سائنڈھ بھی دیوتا، پیپل بھی دیوتا، میں کسے مارتا؟ دیوتا کو تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ یہ تو دو (2) دیوتاؤں کا باہمی معاملہ تھا۔ میں بے نطق و بے ہاتھ رہا۔ عزیزانِ من! کبھی سوچا کسی نے کہ اس سورۃ کی ان آیتوں میں ہر آیت کے آخر میں سَخَّرَهَا آتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جانور دیوتا نہیں بن جاتے۔ انہیں تو تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ یہ تمہارے تابعِ تسخیر ہیں۔ کاہے کے لیے انہیں مسخر کیا ہے؟ اب لیجئے پھر وہی بات آگئی۔ اچھی بات ہے کہ یہ ساری کائنات ہمارے زیرِ تسخیر ہے۔ کوئی ہمارے اوپر نہیں، کوئی ہمارے سے اونچا نہیں، جس کو جی چاہے لتاڑو، جس کو جی چاہے ذبح کرو، موج ہوگی لیکن قرآن کہتا ہے کہ موج نہیں ہوگی سَخَّرَهَا لَكُمْ (22:37)۔ تمہارے لیے تو تمام کائنات بمعہ ان جانوروں کے مسخر کر دی ہے۔

پوری کائنات زیرِ تسخیر لیکن کس مقصد کے لیے؟

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ تسخیرِ کائنات کا ایک مقصد ہے۔ اسے اس کے لیے کام میں لاؤ۔ اور وہ ہے کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هٰذِلْكُمْ (22:37)۔ تاکہ تم خدا کے ضابطہ قوانین کو جس سے اس نے تمہاری راہنمائی کی ہے دنیا کے تمام قوانین و ضوابط پر غالب کر سکو تاکہ تم خدا کی بڑائی کو بروئے کار لاؤ۔

یہ ہے مقامِ انسانیت۔ ساری خدائی اس کے تابعِ تسخیر ہے۔ بہت بڑا مقام ہو گیا لیکن یہ سب کس کے لیے ہے؟ اس لیے نہیں کہ تم دنیا میں فرعون اور نمرود بن جاؤ۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هٰذِلْكُمْ (22:37)۔ یہ جو تمہیں ہم نے راہ نمائی دی ہے اس کی بنا پر خدا کا غلبہ اور اس کی کبریائی دنیا کے اندر مسلط کرو۔ یہ ہے اس کا مقصد۔ یہ اس لیے ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (6:153)۔ تاکہ تم ان احکام کو زندگی کے ہر گوشے میں اپنے سامنے رکھ سکو۔ اس کا کیا نتیجہ ہے؟ کہا کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (22:37)۔

تاکہ تم خدا کے ضابطہ حیات کو دنیا کے تمام قوانین و ضوابط پر غالب کر سکو۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ جواب ہمارے ہاں رسم اذان صرف رسم بن گئی کہ ذبح کرتے وقت تکبیر کہنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ کیارہ گیا ہے بس یہ کہ بسم اللہ اللہ اکبر۔ ”اے وی جیہد اجدی کہوے تے کیمہ دوے ورنہ او حساب ای کردا ہوندا سی۔“¹ یہ جو کیلے² میں ذبح کرنے والا ہوتا ہے اور ”وہاں ہر جانور داریٹ مقرر ہوندا۔ اے تے او نال دیکھیا کردا تریا جاندا ہیگا۔“³ عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ مذہب میں رسم کیسے بنتی ہے۔ یہ تکبیر کا تصور یہاں سے آیا ہے کہ لَتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (22:37)۔ یہاں اس سے آ گیا کہ اللہ کا نام لو اور تکبیر بسم اللہ اللہ اکبر ہو گئی۔ دونوں ہی آ گئے۔ یہاں تکبیر بھی آ گئی اور اللہ بھی آ گیا۔ کہا کہ یہ سارا اس لیے تھا کہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو قائم کرو۔ لَتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هٰذِكُمْ (22:37)۔ یہ تمام ہدایات تمہیں اس لیے دی گئیں، ان کو مسخر اس لیے کیا گیا ہے کہ خدا کی کبریائی کو دنیا کے اندر مسلط کرو۔ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ (22:37)۔ اور جو لوگ اس طرح سے زندگی میں توازن برقرار رکھتے ہیں ان کو خوشخبریاں دو۔ وہ کائنات میں توازن برقرار رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔ ان کا یہ مقام ہوا لیکن یہاں یہ نہیں ہے کہ وہ اکڑ کر یوں ہو گئے، تکبر سے ان کی گردن تن گئی۔ کہا کہ قطعاً نہیں توازن ہے۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ توازن رکھنے میں جہاں کمی ہوتی ہے اسے پورا کر دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والا ہی محسن ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ کچھ کرو گے۔ نتیجہ اس کا کیا نکلے گا؟ کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (22:38)۔ یہ کرو گے تو پھر دنیا میں کوئی قوت تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گی کیونکہ قرآن نے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدْفِعُ (22:38)۔ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ ہم تمہیں تمہارے دشمنوں کی دسترس سے دور رکھیں گے۔

کروڑ ہا کروڑ مسلمان اور ان کے درمیان اتنا سا اسرائیل: آخر غلطی کہاں ہے؟

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ گزشتہ بیس پچیس⁴ سال سے یہ کروڑ ہا کروڑ مسلمانوں، خالص مسلمانوں اور عربوں کی آبادی کے اندر اتنا سا اسرائیل کا ناسور ہے۔ حج کے موقع پر اس کے خلاف دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ حج کرنے والوں کی تعداد میں تو ہر سال دو دو تین تین لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ حج میں اور پھر خاص طور پر عرفات کے میدان میں حج کے بعد یا حرم کعبہ میں دعاؤں پہ دعائیں مانگی جا رہی ہیں: ”یا اللہ اسرائیل دابیڑہ غرق کرائیوں تباہ کر دے۔“ یہ سارا کچھ ہے مگر وہ اسرائیل ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں کہا تھا کہ اگر تم حج میں یہ کچھ کر لو گے تو تمہاری مدافعت ہمارے ذمہ ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! یہ تو وہ وشن ہے جو وہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے وہی کچھ ہم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

1 یہ بھی جس کا جی چاہے تو کہہ دے ورنہ وہ تو (ذہن میں) حساب کتاب ہی کرتا رہتا ہے۔

2 کمپلا۔ (ہندی زبان کا لفظ ہے)۔ مذبح۔ بوجڑ خانہ۔ ذبح خانہ۔

3 وہاں (ذبح خانے میں) ہر جانور (کو ذبح کرنے) کا نرخ مقرر ہوتا ہے۔ وہ تو حساب کرتا ہوا جانور ذبح کرتا چلا جاتا ہے۔

4 یہ کچھ 1977ء کے پہلے ہی ماہ کی دو تاریخ کو کہا جا رہا ہے۔

آخر حفاظت کے سلسلہ میں خدا کا یہ فرمان کیوں پورا نہیں ہوتا؟

عزیزانِ من! اگر یہ مسلمانوں کا جم غفیر کسی ایک تقریبِ حج پہ بھی کھڑا ہو کر سوچتا کہ اس نے تو کہا تھا کہ یہ کچھ کر لو گے تو تمہاری حفاظت ہم کریں گے اور یہاں تو ہم کروڑوں کی تعداد کے اندر سارے مل کے بھی اتنوں کے سامنے ہماری حفاظت نہیں ہو رہی ہے۔ چیخ رہے ہیں اسرائیل کے ہاتھوں رو رہے ہیں تو کہیں کوئی نقص ہے مگر وٹن، جمود، سکوت، سوچنے نہیں دیتا۔ پھر ہر اگلے سال اسی طرح سے حج ہوتا چلا جا رہا ہے، سال بھر اسی طرح سے عمرہ ہوتا چلا جا رہا ہے، اسرائیل کی خطرناک قوتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ ذمہ داری تو خدا نے اپنے اوپر لی ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدْفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ہم حفاظت کریں گے۔ صرف ان کی جو ہمارے ضابطہ حیات پر ایمان لاتے ہیں، مگر اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿٣٨﴾ (22:38)۔ جو لوگ فلاح و بہبود انسانیت کے امین نہیں، جن پر کسی صورت میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور جو نظامِ خداوندی کی صداقت سے بہ شد و مد انکار کرتے ہیں وہ خدا کے نزدیک کیسے پسندیدہ ہو سکتے ہیں؟ اس لیے یاد رکھو! جو غرض و غایت کا ہی انکار کر دے اور جن کی ان رسوم کی ادینگی کے بعد ان کے اوپر اعتماد ہی نہ کیا جاسکے، یہ لوگ اس کے ہاں پسندیدہ نہیں ہیں۔ یہاں انہیں خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿٣٨﴾ (22:38) کہا ہے اور یہ کچھ کہنے کے بعد، عزیزانِ من! غور کیجیے پہلی دفعہ قرآن میں یہ آیت آئی ہے جہاں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ بِاَنۡفُسِهِمْ ظٰلِمُوْا ﴿٣٩﴾ (22:39)۔

یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں (یعنی جماعتِ مومنین) کو جن پر مخالفین کی طرف سے اس قدر مظالم توڑے گئے ہیں اور جن کے خلاف اب وہ میدانِ جنگ تک اتر آئے ہیں، دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ ساری تیاریاں اس طرح سے کرنے کے بعد کہا کہ ہاں اب تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ تم بھی اب ان مخالفین کے خلاف میدانِ جنگ میں آ جاؤ گے کیونکہ بِاَنۡفُسِهِمْ ظٰلِمُوْا ﴿٣٩﴾ (22:39)۔ ان لوگوں کے اوپر جن کو ہم اجازت دے رہے ہیں بڑے مظالم کیے ہیں۔ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِہُمْ لَقَدِيْرٌ ﴿٣٩﴾ (22:39)۔

اللہ ان مظلوموں کی مدد کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یعنی اب وہ وقت آ گیا ہے جو ہم کہیں گے کہ ہم ان کی نصرت کے اوپر قادر ہیں۔ یہ تو یہ کر لیں گے تو پھر عزیزانِ من! بات اسی ضمن میں آگے چلتی جا رہی ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ میں تھک گیا ہوں آگے ہمت نہیں پڑ رہی۔ اس لیے آج کے لیے آپ سے اتنا ہی وقت لیتا ہوں۔ ہم آیت 39 تک آگئے ہیں، چالیس آیت سے آئندہ لیں گے۔

① تاج العروس میں ہے کہ حَتَّانٌ، يَحْتَوُنْ، حَتَوْنَا سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس شخص کو امانتدار سمجھا جائے وہ اپنی امانت اور عہد کا پاس نہ کرے۔ یہ دراصل اعتماد اور بھروسہ کو ضائع کر دینے کا نام ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ حَتَّانُ الدَّلُوْا الرِّشَاءُ رَسِيْ نے دُول سے وفانہ کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی جس کے سبب دُول کنویں میں گر گیا اس لیے حَتَّانِ ہر ایسے شخص کو کہہ سکتے ہیں جس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جاسکے اور وہ دشمن بھی جو تمہاری حالت میں خرابی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لغات القرآن

ن ح ر

والا^④۔ اس لئے وَأَنْحَرُ [108:2] کے معنی ہوں گے، اس پر وگرم کے متعلق تمام امور پر علم و عقل اور تجربہ و بصیرت سے پوری پوری طرح حاوی ہو کر ان پر نہایت مضبوطی سے عمل پیرا ہو۔ لیکن اگر اس آیت میں وَأَنْحَرُ سے مراد 'اونٹ کا ذبح کرنا' لیا جائے تو اس سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ مدینہ تشریف لائے تو حالت یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت (انصار اور مہاجر دونوں) غریب اور کمزور تھی اور مدینہ میں یہودیوں کا بڑا زور تھا۔ ایسے حالات میں کمزور جماعتیں ہمیشہ طاقتور جماعتوں کے سہارے ڈھونڈھتی ہیں اور اس کے لئے اپنے اصولوں تک کو قربان کر دیتی ہیں۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا اور مسلمانوں کے ہاں حلال۔ وہ اونٹ کے ذبیحہ کو قابل اعتراض سمجھتے تھے۔ وہ مدینہ میں اپنی قوت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ مسلمان ان سے دب کر رہیں گے اور اونٹ کو ذبح کرنے سے محتاط رہیں گے۔ قرآن کریم نے عین اس مقام پر حکم دیا کہ مدینہ میں 'اونٹ ذبح کرو'۔ یعنی دین کے معاملہ میں یہودیوں سے مفاہمت کا خیال نہ کرو۔ چنانچہ اس کمزور جماعت نے تھوڑے ہی دنوں میں اتنی قوت پیدا کر لی کہ یہودی (جو اپنی فتنہ پرداز یوں سے باز نہیں آتے تھے) مدینہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ضمن میں بعض نے

نَحَرَ الصَّدْرِ۔ سینے کا اوپر کا حصہ سینہ پر جہاں ہار پہنا جاتا ہے۔ نَحَرَ الْبَعِیْثِ یَنْحَرُ لَا نَحَرَ اس نے اونٹ کے سینہ سے متصل اس جگہ پر نیزہ مارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے۔ (اونٹوں کو اسی طرح ذبح کرتے ہیں^①)۔ ابن فارس نے بھی لکھا ہے کہ اس مادہ سے کئی الفاظ آتے ہیں۔ سینے کو بھی کہتے ہیں اور سینے کے چیر دینے کو بھی۔

قرآن کریم میں ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَأَنْحَرُ [108:2]۔ اس میں وَأَنْحَرُ کی بہت سی تفاسیر صاحب تاج نے لکھی ہیں۔ مثلاً (1) نماز میں کھڑا ہو کر سینے کو باہر کی طرف نکالنا۔ (2) نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا۔ (3) قربانی کے جانوروں (اونٹوں) کو ذبح کرنا۔ (4) نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا۔ (5) نماز میں (نحر تک) ہاتھ اٹھانا۔ (6) اپنے سینہ کو قبلہ رخ رکھ کر کھڑے ہونا۔ (7) خواہشات کا قلع قمع کرنا۔ (8) دن کے ابتدائی حصہ میں (قبلہ رخ) کھڑے ہونا^①۔ لیکن نَحَرَ کے معنی ہیں دسترس پیدا کرنا۔ کسی بات پر حاوی ہو جانا۔ اسے اچھی طرح حاصل کر لینا۔ نَحَرَ الشَّيْءِ عَلَماً میں علم کے ذریعے اس معاملہ پر حاوی ہو گیا^③۔ نَحَرَ الْأُمُورِ عَلَماً اس نے معاملات کو اچھی طرح سمجھ لیا^④۔

چنانچہ النَّحْرُ وَالنَّحْرِیُّ کے معنی ہیں ماہر، عقل مند، تجربہ کار، ہر چیز کو سمجھنے اور دیکھنے والا اور مضبوطی سے اس پر عمل کرنے

کہا ہے کہ عبرانی زبان میں ”کوشر“ حلال ذبیحہ کو کہتے ہیں۔ تجھے (اونٹ) بطور حلال ذبیحہ کے عطا کیا۔“ لیکن ہم نے اَلْكَوْثَرُ [108:1] اسی سے معرب ہے اس اعتبار سے اِثَّاقاً اس مفہوم کو ترجیح نہیں دی۔ دیکھئے عنوان (ک)۔ اَعْظَمُكَ اَلْكَوْثَرُ [108:1] کے معنی ہوں گے ”ہم نے (ث۔ر)۔

یکے از مطبوعات کاروانِ باغبان

مری میں طلوعِ اسلام کے سب سے پرانے قاری

● (1) فضل الہی مغل فوٹو گرافر دی مال مری

● (2) کپتان محمد رمضان آف میاڑی مری

کچھ پرانی یادیں

1956ء کی کسی شب محمد ریاض آف گہل میرے پاس آئے ان کے ساتھ ماسٹر عبدالقیوم آف گہل بھی تھے۔ محمد ریاض صاحب نے مجھے ماہنامہ عارف لاہور اور ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور کے پرچے دیے۔ طلوعِ اسلام میں نے پہلی بار دیکھا تھا یہی محمد ریاض صاحب مری کے پہلے پی ایچ ڈی بنے اب وفات پا گئے ہیں۔

طلوعِ اسلام کنونشن

طلوعِ اسلام کی پہلی کنونشن 1956ء میں لاہور میں ہوئی تھی۔ میں نے شرکت کی کوشش کی لیکن اجازت نہ ملی اور دوسری کنونشن 1957ء میں شرکت کی۔ شرکاء کے ناموں میں میرا نام بھی شامل فہرست ہے۔

کاروانِ باغبان کا پرانا نام باغبان ایسوسی ایشن تھا۔ راولپنڈی کے ایک ادارے نے باغبان ایسوسی ایشن اپنے نام رجسٹرڈ کروالی اور ہم نے نیا نام ”کاروانِ باغبان“ استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ملک حنیف وجدانی، کاروانِ باغبان، مری

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شرارِ زندگی

(استقبالیہ طلوع اسلام کنونشن منعقدہ 17 لغایت 19 اکتوبر 1969)

دما دم نقش ہائے تازہ ریزد بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست
ترجمہ: زندگی ہر پل نئی صورتیں ڈھالتی ہے (ایک نیا نقش پیدا کرتی ہے)۔ (کسی) ایک صورت پر
زندگی کا ٹھہراؤ نہیں (زندگی کو ایک صورت پر قرار نہیں)۔ اگر تیرا آج کل ہی کی تصویر ہے (اور اس میں
کوئی تبدیلی نہیں آئی) تو تیری مٹی میں زندگی کی چنگاری نہیں ہے۔

رفیقانِ محترم! سلام و رحمت

مقام ہزار تشکر و امتنان ہے کہ سرمستانِ بادۂ فرقانی، سال بھر کی مفارقت کے بعد آج پھر انجمن آرائے بزمِ قرآنی ہو
رہے ہیں۔ یوں تو اگر (غالب کے الفاظ میں) شبہائے ہجر کو بھی حساب میں رکھا جائے تو سال بھر کی یہ مدت بڑی طویل اور
وجہ کاہش جاں ہوتی ہے، لیکن انتظار کی صبر آزاں گھڑیوں کے بعد کی ملاقات بھی اپنے اندر ایک جداگانہ لذت رکھتی ہے۔
ندیم قاسمی کے الفاظ میں۔

میں جب بھی تجھ سے ملا جیسے پہلی بار ملا بڑا سرور ملاقاتِ گاہ گاہ میں ہے
حقیقت یہ ہے کہ جس وقت سے آپ کے اس ”حسین و سادہ ورگیں“ اجتماع کی تجاویز کا شانہ فکر سے ابھرنی شروع
ہوتی ہیں، میرے جملہ تصور کے دیدہ یعقوب میں، عجیب انداز کی یوسف سامانیاں، عطربیز و نور پاش ہونے لگ جاتی ہیں اور
میرے منتظر بہار چمن آرزو کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ۔

ہوا کے دوش پہ آتی ہے دور کی خوشبو پرانی یادوں سے دیوار و درمہک اٹھے
اور آپ، پیکرِ ان خلوص و محبت کے قدموں کی آہٹ، نویدِ جانِ فزا کی قاصد اور نشیدِ جاں نواز کی پیغامِ بر بن کر، فردِ دوشِ گوش
بنتی ہے، تو یہاں کی ساری فضا میں مسرتیں ناچنے لگتی ہیں۔ اور اس کے بعد آپ کی آمد۔ بس یوں کہتے کہ
چمن میں رقص کرتے جب ترے آشفۂ سر آئے گلوں کا ذکر کیا، کانٹوں کے چہرے بھی نکھر آئے

آباد رہیں وہ راہیں جن کے ذرات آپ کے نقوشِ قدم کی تابانیوں سے، ہر ہر وادی شوق کے لئے نشانِ منزل بنتے ہیں اور سرشار رہیں وہ فضا میں جن میں آپ کے نفس ہائے حیات آفریں تحلیل ہو کر، ہر وادۂ سفر کے لئے ولولہ تازہ کے نقیب قرار پاتے ہیں۔ خدا آپ کے جذبہ عشق کی انقلاب انگیزیوں کو برق آمیز توانائیاں عطا فرمائے کہ انہی سے اس عہدِ خدا فراموش و خوفروش کی ظلمتوں کے سینے چاک ہوتے ہیں۔

ایک سال کی مسافت:

ہم رہا ہر وادی شوق! اللہ الحمد کہ ہم بے سرد سامانوں کے قافلہ خاموش پانے کامل جذب و انہماک سے سرگرم سفر رہتے ہوئے، ایک سال کی مزید مسافت بڑے سکون و اطمینان سے طے کر لی۔ یہ سال پاکستان ہی کے لئے نہیں، تمام اقوامِ عالم کے لئے، عجیب ہنگامہ خیزیوں اور شورش انگیزیوں کا سال رہا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ تاریخ انسانیت کے شش ہزار سالہ ہنگامے جو فضا کی سُر مائی چادریں اوڑھے، ساکت و صامت مَحْوِ خواب تھے، زمانے کے تقاضوں کے صورِ اسرافیل سے، یک بیک بیدار ہو کر۔ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ (21:96)۔ فضا کی پہنائیوں سے فرشِ زمین پر آن اترے ہیں اور آتشیں عفاریت کی طرح چیختے، چلاتے، دھاڑتے، غراتے، اطرافِ عالم میں پھیل گئے ہیں اور یہ سیلاب جہاں آشوب کسی کے تھامے نہیں تھمتا۔ جلسے، جلوس، احتجاجات، مظاہرات، الزام تراشیاں، دشنام طرازیاں، خشت باریاں، آتش زبیاں، خوں ریزیاں، غارت گریاں، پتھراؤ، گھیراؤ۔ غرضیکہ کون سا جناتی حربہ تھا جو قصرِ آئین و قوانین کی بنیادوں تک کو ہلا دینے اور شجرِ تہذیب و تمدن کو جڑ سے اکھیر دینے کے لئے اختیار نہ کیا گیا ہو۔ یہ آگ چونکہ عالم سوز تھی، اس لئے خطہ پاکستان اس سے کس طرح محفوظ رہ سکتا تھا؟ یہ بھی اس کی لپیٹ میں آیا۔ اور بُری طرح آیا۔ لیکن اللہ الحمد کہ ہمارا یہ مختصر سا کاروانِ جذب و مستی، ان ہنگامہ خیزیوں سے یکسر محفوظ رہا اور کہیں سے اس قسم کی کوئی خبر موصول نہیں ہوئی کہ بزمِ ہائے طلوعِ اسلام کے کسی رُکن نے ان ہنگاموں میں کسی قسم کا حصہ لیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ قرآنی تعلیم کا اعجاز ہے جو اس قسم کی عالمگیر شورشوں میں بھی دماغی توازن کھونے نہیں دیتا۔

در جنوں از خود نہ رفتن، کارِ ہر دیوانہ نیست

(مفہوم: جنون کے عالم میں آپے سے باہر نہ ہونا ہر دیوانے کے بس کا کام نہیں۔ س۔ ا۔)

مبداء فیض کی یہ کتنی عظیم کرم گستری ہے کہ ہمارا یہ کاروانِ شوق، جس سکوت و سکون سے، گذشتہ تیس سال سے اپنی منزلیں طے کرتا چلا آ رہا تھا، وہ ان آندھیوں اور جھکڑوں کے طوفان میں بھی اسی سکوت و سکون سے محو خرام رہا۔ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، ہمارے دور کی اس زلزلہ انگیز تاریخ میں یہ انفرادیت صرف آپ کی تحریک کے حصہ میں آئی ہے کہ خارجی ہنگامہ خیزیوں سے نہ آپ کے قلبِ مطمئن پر کسی قسم کا ہیجان پیدا ہوا، نہ پائے استقامت میں لغزش آئی۔ کیا ہمارے لئے یہ انفرادیت کچھ کم وجہ ناز ہے کہ۔

بے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما!

(مفہوم: ہمارے قافلہ کی گھنٹیاں بغیر شور مچانے بجتی ہیں یعنی ہمارا کارواں خاموشی سے چلتا رہتا ہے۔ س۔ ا)

میں عزیزانِ من! اس قدر شدتِ اشتعال میں آپ کے اس ضبطِ خویش اور انتہائے خروش میں پاسداری گریباں^① پر آپ کو جس قدر بھی مستحقِ مبارک باد قرار دوں، کم ہے۔

شرِ مستطیر کی چنگاریاں:

البتہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ: وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَتْ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا (76:7) ”مومن اس دور سے خائف رہتے ہیں جس میں شر کی چنگاریاں دور دور تک اڑ کر پہنچ جاتی ہیں۔“ تو یہ چنگاریاں ہمارے ہاں بھی بعض افراد کے سکونِ ذہنی کو تھوڑا بہت متاثر کر گئیں۔ اس کا مظاہرہ اُس تقاضا کی شکل میں ابھرا جو اس سے پہلے بھی کبھی کبھی ایسے احباب کی طرف سے سامنے آیا کرتا ہے جو شدتِ جذبات سے صبرِ طلبیِ عشق کے مقابلہ میں بتیائی تمنا^② سے مغلوب ہو کر کہہ اٹھتے ہیں کہ زمانہ بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے اور ہماری تحریک بڑی سست خرام ہے۔ ہمیں بھی ہنگامی سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ جب ہمارے پاس نظامِ ربوبیت کا قرآنی پروگرام موجود ہے تو ہم اسے عمل میں لانے کے لئے سیاسی جدوجہد کیوں نہ کریں۔ مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ یہ آواز معدودے چند افراد تک محدود رہی اور دیگر احباب نے انہیں وہیں سمجھا دیا کہ ہماری تحریک کا مقصد قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے۔ عملی سیاسیات میں حصہ لینا نہ ہمارے پروگرام میں داخل ہے نہ ہم اسے اپنے پروگرام میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارا بے شک یہی مسلک و موقف ہے اور ہم اسی پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے ان دوستوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انہیں تو صرف ان کی اپنی بتیائی تمنا اس قسم کے تقاضوں پر مجبور کرتی ہے انہیں کیا معلوم کہ مجھے عملی سیاست کی نگاہ فریب وادیوں کی طرف کیسی کیسی پرکشش آوازیں دعوتِ نظارہ دیتیں اور کیسے کیسے معصوم لالچ چھلاوا بن کر بہکاتے ہیں۔ لیکن میرا سرِ نیاز بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے کہ اس نے مجھے یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ میں ان پُر فریب جاذبیوں پر قابو پا کر نہایت خاموشی سے اپنے راستے پر گامزن رہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں نے جو قرآنی آواز آج سے تیس سال پہلے بلند کی تھی آج بھی اُسی کو دہرا رہا ہوں، ورنہ عملی سیاست کی مصلحت کوشیاں قدم قدم پر گر گٹ کی طرح رنگ بدلتیں اور ایک ایک سانس میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرتی چلی جاتی ہیں۔ اپنے دعویٰ کی صداقت پر یقین محکم اور اس کے حصول کے لئے جو راستہ اختیار کیا جائے، اس پر استقامت یہی قرآن کی رُوسے وہ روش ہے جو انسان کو منزلِ مراد تک پہنچا سکتی ہے۔ إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔۔۔ وہ لوگ جو قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے اس دعویٰ پر مستقل مزاجی سے کھڑے رہتے ہیں یہی وہ صاحبانِ ثبات و یقین ہیں

① باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتن
② عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

درجنوں از خود زلفتن کارِ ہر دیوانہ نیست (اقبال)
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک (غالب)

جن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبَشِّرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ یہ کہتے ہوئے کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کھاؤ نہ افسردہ خاطر ہو۔ اور اس جنت کی بشارت ہم سے لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ نَحْنُ اَوَّلِيُوْكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴿۳۱-۳۰﴾ ہم دنیا میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی تمہارے رفیق۔ یہ تھیں برادرانِ گرامی قدر! قرآن کی وہ اطمینان بخشیاں اور یقین افروزیاں جنہوں نے میرے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی۔ اور میں این و آں سے بے خبر اس چراغِ تہ داماں کی روشنی میں جانبِ منزل رواں دواں رہا، ورنہ راستے کے پری خانے چاہ بابل سے کم سحر آمیز نہ تھے۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا، ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے
ہمارا دستورِ اساسی:

میں عزیزانِ من! اس مقام پر ضروری سمجھتا ہوں کہ اس حقیقت کو اور بھی نمایاں طور پر آپ حضرات کے سامنے لاؤں۔
بزمِ مہائے طلوعِ اسلام کے دستورِ اساسی (مطبوعہ مئی 1966ء) کی پہلی شق حسبِ ذیل ہے:

بزمِ طلوعِ اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ۔ یہ ایک اجتماعی کوشش کا ذریعہ ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لیے جسے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اسلام میں جو غیر قرآنی تصورات شامل ہو گئے ہیں انہیں الگ کر کے پھر سے اس نظام کی تشکیل کے لیے فضا سازگار بنائی جائے جو عہدِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ (48:29) میں قائم ہوا تھا اور جسے خلافتِ علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے۔

شقِ اوّل کا اتنا حصہ ہمارے نصب العین کو متعین کرتا ہے۔ اس کا بقایا حصہ اس نصب العین کے حصول کا طریق بتاتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

اس فکر کی نشر و اشاعت کے لیے نہایت پر امن طریق اختیار کیا جائے گا۔ مثلاً ماہنامہ طلوعِ اسلام، طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہونے والے پمفلٹ اور کتابیں، پرویز صاحب کا درس قرآن کریم اور ان کے خطابات جو مختلف تقاریب پر پیش کیے جائیں۔ سنجیدہ انداز میں گفتگوئیں، جن میں بحث و جدل کا انداز نہ ہو۔
اس کے بعد ہے:

اگر مقامی طور پر کسی اور طریق کو بھی مؤثر سمجھا جائے تو ادارہ سے اس کی منظوری لینا ضروری ہوگا۔ اصولاً اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اس مقصد کے لیے کوئی ایسا طریق اختیار نہیں کیا جائے گا جس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی، غوغا پروری یا تفرقہ انگیزی پائی جائے۔

دستورِ اساسی کی شق دوم میں اس کی وضاحت کردی گئی ہے کہ:

کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔۔۔ کوئی رکن ایسی بات نہیں کریگا جس سے فرقہ بندی، پارٹی بازی یا تفرقہ انگیزی کا شائبہ تک پایا جائے۔۔۔ یا وہ پاکستان کی آئینڈیا لوجی اور اس کے استحکام کے خلاف ہو۔

میں مختلف بزموں کے نمائندوں سے درخواست کروں گا کہ وہ بزم کے اجلاس میں اس دستور اساسی کو اپنے سامنے رکھا کریں اور اگر کوئی رکن اس مقصد اور اس کے حصول کے ان طریقوں سے ہٹ کر کوئی اور تجویز پیش کرنا چاہیں تو انہیں یہ کہہ کر روک دیا جائے کہ یہ تجویز ہمارے دستور کی حدود سے باہر ہے۔ اس قسم کی تجاویز خواہ وہ بظاہر کتنی ہی منفعت بخش اور پُرکشش کیوں نہ دکھائی دیں، تحریک کے لئے بڑی مضرت رساں ہوتی ہیں۔ وہ آپ کی توجہات کو اصل مقصد سے ہٹا کر دوسری طرف منتقل کر دیتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اصل اسکیم بروئے کار آتی نہیں اور اپنی منزل کی طرف بڑھنے کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں جب وحدت مقصد کی بجائے مختلف مقاصد آپ کے سامنے آنے شروع ہو جائیں تو اس سے لامحالہ اختلاف پیدا ہوگا اور اختلاف کا نتیجہ انتشار اور خلفشار۔ یاد رکھیں۔ گاڑی ہمیشہ (Track) پر چلتی ہے (Track) سے ادھر ادھر ہٹنے کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے اور دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والا تو کبھی ساحل مراد تک نہیں پہنچ سکتا۔

اپنی الگ بستی:

عزیزانِ من! اس سلسلہ میں میں آپ کی توجہ ایک اور گوشے کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ادارہ ابھی کراچی میں تھا تو ایک اسکیم سامنے لائی گئی تھی کہ ہمیں اپنی ایک الگ بستی بسانی چاہئے جس میں نظام ربوبیت کو عملاً متشکل کیا جائے۔ اُس زمانے میں اس اسکیم پر کافی غور و خوض کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسکیم نہ صرف ناممکن العمل ہے بلکہ ایسا کوئی اقدام جس سے ہم باقی مسلمانوں سے الگ ایک گروہ متصور ہوں، قرآن کی رو سے شرک ہوگا اور ہماری تحریک کے لئے قبر کا گڑھا۔ اس لئے نہ صرف اس اسکیم ہی کی مخالفت کی گئی بلکہ سخت احتیاط برتی گئی کہ ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس میں گروہ بندی، فرقہ داری یا پارٹی سازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ یہ اسی شدت احتیاط کا نتیجہ ہے کہ ہم کنونشن کے اجتماعات تک میں نماز پڑھنے کا الگ انتظام بھی نہیں کرتے۔ قریب کی مساجد میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔

مجھے اس وقت اس اسکیم کی یاد اس لئے تازہ کرانی پڑی کہ اب بھی کہیں کہیں سے اس کی صدائے بازگشت فضا میں ارتعاش پیدا کرنے کا موجب بن جاتی ہے اور چونکہ جذباتی اپیل میں بڑی کشش ہوتی ہے اس لئے سادہ دل بندے اس قسم کی اسکیموں سے متاثر ہو جاتے ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہماری تحریک اس قسم کی اسکیموں کو عمل میں نہیں لاتی، تو اس پر بے عمل تحریک ہونے کا الزام لگادیا جاتا ہے۔ یوں اس قسم کی ناممکن العمل، نظری، مقدس (Pious) تجاویز آپ کی تحریک کی راہ میں کانٹے بن کر بکھر جاتی ہیں۔

باہمی ہمدردی:

بعض احباب یہ بھی کہتے ہیں کہ طلوع اسلامی دوستوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور شادی غمی میں شامل ہونا چاہئے۔ اس باب میں تو دورائیں ہی نہیں ہو سکتیں کہ دوستوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک اور شادی غمی میں

شامل ہونا چاہئے، لیکن اگر اس سے منشاء یہ ہے (یا یہ اقدام آپ کو اس مقام تک پہنچا دیتا ہے) کہ آپ دکھ درد اور شادی غمی کو اپنی فکر سے ہم آہنگ احباب تک محدود کر دیں، تو معاف فرمائیے، اس سے آپ ایک نئے ربوہ کی بنیاد رکھ دیں گے اور قرآن کی میزان میں اسے کیا کہا جائے گا، اس کا آپ کو علم ہی ہے۔ اس لئے میں ان احباب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس قسم کے جذباتی تصورات سے نادانستہ تباہیوں کے جن عمیق غاروں کی طرف قدم اٹھانے کے مرتکب ہو سکتے ہیں ذرا ٹھنڈے دل سے ان کا اندازہ ضرور کر لیا کریں اور یونہی شدت جذبات کی رو میں نہ بہہ جایا کریں۔ اور اصل تو یہ ہے کہ جذبات کی شدت میں بہہ جانیوالی ذہنیتیں قرآنی پروگرام میں فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتیں۔

بعض احباب کہتے ہیں کہ یہ مشہور ہونے پر کہ ہم طلوع اسلام کی فکر سے ہم آہنگ ہیں، محلہ یا علاقہ کے لوگ ہم سے قطع تعلق کر لیتے ہیں، اور اس طرح ہم یتیم بن کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے اس کا علم ہے۔ اور ملک کے بعض حصے تو ایسے ہیں جہاں یہ قطع تعلق انتہائی شدت اختیار کر جاتا ہے۔ لیکن میں ان احباب کو ہمیشہ یہی مشورہ دیا کرتا ہوں کہ آپ اپنی سیرت اور اخلاق میں ایسی کشت پیدا کریں کہ محلہ یا علاقہ کے شریف النفس طبقہ کے دل میں آپ کی عزت اور احترام پیدا ہو جائے۔ اس سے آپ اپنے ماحول میں یتیم بن کر نہیں رہ جائیں گے۔ قرآن نے ایسے ہی مواقع کے لئے کہا تھا کہ: وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34) برائی اور بھلائی دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتیں۔ تم برائی کی مدافعت انتہائی بھلائی کے ساتھ کرو۔ تم دیکھو گے کہ اس سے تمہارے دشمن بھی جگری دوست بن جائیں گے۔ میں اپنے ان احباب سے عرض کروں گا کہ آپ قرآن کے اس نسخہ کو اپنے ہاں استعمال کر کے دیکھیں۔ اسے آپ یقیناً مفید اور کامیاب پائیں گے۔ ہمارے دستور اساسی کی شق 2 (ج) اسی حقیقت کی مظہر ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

تحریک طلوع اسلام کے دو گوشے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے موجودہ غیر قرآنی معاشرہ کو قرآنی معاشرہ میں تبدیل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس دعوت پر انفرادی طور پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسرا گوشہ یہ ہے کہ افراد کے اندر وہ اچھے اخلاق پیدا ہوں جو قرآن کریم کی تعلیم اور سیرت نبی اکرم ﷺ سے ہو پیدا ہوں۔ بزم کے ہر رکن کو حتیٰ الامکان کوشش کرنی چاہئے کہ اس کی سیرت ان اخلاق کی آئینہ دار ہو۔ ہر شخص کے ساتھ خوش معاملگی، حسن اخلاق کی بنیادی اینٹ ہے۔

بعض بزموں کے اجلاس کی روئیداد سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بعض اوقات معاملات زیر نظر پر بحث و تمحیص، افہام و تفہیم کے بجائے مناظرانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس قسم کا مجادلانہ انداز مذہبی مناظروں یا سیاسی اکھاڑوں کا تو ہو سکتا ہے۔ جس تحریک میں نہ معتقدات کی اختلافی جنگ ہو اور نہ مفاد پرستی کی رسہ کشی، اس میں اس قسم کے انداز کا پیدا ہو جانا ناقابل فہم سی بات ہے۔ قرآن کریم نے اس قسم کے مجادلانہ انداز گفت و شنید کی وجہ بَغِيًّا بَيْنَهُمْ بتائی ہے۔ یعنی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کا جذبہ۔ اور اسے مذہبی پیشوائیت کا شعار بتا کر اس کی سخت مذمت کی ہے۔ قرآنی مجالس میں اس قسم کی ذہنیت

یا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہونا چاہئے۔ ذرا سوچئے عزیزانِ من! کہ ہماری مجالس میں کون سے ایسے مسائل زیر بحث آتے ہیں جن میں نوبت باہمی مجادلہ تک پہنچ جائے۔ ہم نے اپنی میٹنگز میں سوچنا صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کونسا طریق اختیار کیا جائے جس سے قرآنی فکر کی زیادہ سے زیادہ نشر و اشاعت ہو سکے۔ پھر اس میں کسی کے لئے کچھ لینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا اس میں تو ہر ایک نے کچھ نہ کچھ دینا ہی ہوتا ہے۔ علاوہ بریں بزم میں مختلف عہدہ داریاں بھی نہیں ہوتیں کہ سیاسی پارٹیوں کی طرح، ان کے حصول کے لئے باہمی رقابت شروع ہو جائے۔ اس میں صرف ایک نمائندہ ہوتا ہے جس کے سر پر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے اور وہ ان ذمہ داریوں کو (دیگر اراکین کی طرح) رضا کارانہ طور پر سرانجام دیتا ہے۔ اندریں حالات رفیقانِ گرامی قدر! ہماری بزم کے اجلاس ہوں یا ان سے باہر باہمی معاملات ہمارے آپس کے تعلقات انتہائی یگانگت، محبت، اخلاص اور مؤدبت کے ہونے چاہئیں۔ ہم ایک دوسرے سے خندہ پیشانی سے ملیں، شیریں کلامی سے گفتگو کریں، اور قلبی یگانگت اور موانست سے رُحَّاءِ بَيْنَهُمْ کا عملی نمونہ پیش کریں۔ ہمارے دستورِ اساسی میں یہ شق بھی موجود ہے کہ جو صاحب بزم کارکن بننا چاہیں ان کے متعلق علاوہ دیگر امور اس بات کا بھی اطمینان کر لینا چاہئے کہ وہ دیگر اراکین بزم کے ساتھ دلی رفاقت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اختلافی معاملات پر بحث و تمحیص کے وقت اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے کہ۔

مسئلے ضد سے اُلجھتے ہیں، سلجھ سکتے نہیں وہ نہ سمجھیں گے تو اپنے آپ کو سمجھاؤں گا جہاں تک فیصلوں کا تعلق ہے آپ کے دستورِ اساسی میں یہ شق بھی موجود ہے کہ:

نمائندہ کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ فیصلہ طلب امور میں اراکین بزم سے مشورہ کرے۔۔۔۔۔ لیکن ہر معاملہ میں آخری فیصلہ نمائندہ کا ہوگا۔ اور اراکین بزم پر اس فیصلے کی پابندی لازمی ہوگی۔

جس شخص کو آپ اپنا حکم تسلیم کر لیتے ہیں اس کے فیصلوں کی پابندی کی ابتدائی شکل تو یہی ہوتی ہے کہ اسے ایک قانونی پابندی کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ لیکن ہمیں اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنی چاہئے کہ ان فیصلوں کے سامنے سر تسلیم اس طرح خم کیا جائے کہ (قرآن کے الفاظ میں) ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيْمًا (4:65) ان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کبیدگی محسوس نہ ہو۔ ہاں اگر کوئی فیصلہ ایسا ہو جو کسی رکن کے نزدیک قرآنی ہدایت کے خلاف ہے یا اس کا اثر تحریک کے خلاف پڑتا ہے تو دستورِ اساسی میں یہ شق بھی موجود ہے کہ اس کے خلاف ادارہ سے اپیل کی جاسکتی ہے۔

یہ دستور وہ ہے جس کے متعلق ہر رکن فارم رکنیت پر دستخط کرتے وقت یہ اقرار کرتا ہے کہ:

میں نے دستورِ اساسی و اصولی ہدایات برائے بزمہائے طلوع اسلام کا مطالعہ کر لیا ہے۔ ان کے مطابق میں بزم کارکن بننا چاہتا ہوں اور ان پر پابند رہنے کا عہد کرتا ہوں۔

یہ اقرار نامہ رسمی نہیں۔ قرآنی آئین میں کوئی قول و اقرار بھی رسمی نہیں ہوتا۔ اس کی پابندی شرطِ رکنیت ہے۔ جو رکن اس کی پابندی نہیں کرتا یا کرنا نہیں چاہتا وہ بزم کارکن نہیں رہ سکتا۔ جسے خود اپنے اقرار نامہ کا پاس نہ ہو وہ قرآنی راہنمائی سے

کس طرح بہرہ یاب ہو سکتا ہے؟ مومنین کی تو قرآن کریم نے خصوصیت یہ بتائی ہے کہ: **هُمْ لَا مُنْتَهٰی لَهُمْ وَعَهْدُهُمْ رُحُوْنٌ** (23:8) وہ اپنی امانات اور معاہدات کی بڑی نگہداشت کرتے ہیں۔

سپاس گزاری:

راستہ کی ان خطرناک گھاٹیوں کی نشاندہی کرانے کے بعد رفقاء محترم! یہ احساس میرے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے کہ میں آپ کی اُن مساعی جمیلہ کے لئے آپ کی خدمت میں ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کروں جو آپ کی طرف سے سال بھر میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں ظہور میں آئی ہیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے ہماری تحریک سرمایہ داروں کی تحریک نہیں۔ نہ ہی اسے کہیں سے کوئی امداد ملتی ہے۔ جو تحریک ہر غلط بات کو غلط کہہ دے اور لگی لپٹی بغیر پکار کر کہہ دے اُسے اس زمانے میں امداد کہاں سے مل سکتی ہے؟ ہماری تحریک سے وابستہ حضرات اُس طبقہ سے متعلق ہیں جسے عرف عام میں متوسط (یا سفید پوشوں کا) طبقہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں امداد کہاں سے مل سکتی ہے؟ ہماری تحریک سے وابستہ حضرات اُس طبقہ سے متعلق ہیں جسے عرف عام میں متوسط (یا سفید پوشوں کا) طبقہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں دیانتدارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی آمدنی کی محدودیت اور اشیائے صرف کی ہوش ربا گرانی نے اس طبقہ کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ اب ملک میں عملاً دو ہی طبقے رہ گئے ہیں۔ اوپر کا طبقہ جو اُن چند گھرانوں پر مشتمل ہے جن میں دولت اُمند کر آگئی ہے اور نچلا طبقہ جو کسی نہ کسی طرح مرتے بھرتے زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ ہماری تحریک سے دلچسپی رکھنے والے اس دوسرے طبقہ سے متعلق ہیں۔ اور قرآنی شہادت کے مطابق، آسمانی انقلاب کی دعوت پر لبیک، سب سے پہلے ہوتی بھی اسی طبقہ کی طرف سے ہے۔ لہذا ہمارے ذرائع لا محدود کیسے ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ کا جذبہ صادقہ اور قابل رشک ہمت ہے جو اس قدر حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنا پیٹ کاٹ کر اس قرآنی دیئے کے لئے تیل، بتی کا انتظام کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آپ احباب کے اس ایثار کی میرے دل میں بڑی قدر ہے اور میزانِ خداوندی میں اس کا بڑا وزن۔ اللہ تعالیٰ آپ کی ہمتوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔

درخشندہ نتائج:

قرآن کے پیغام انقلاب اور کی نشر و اشاعت کے لئے آپ کی سالہا سال کی نہایت خاموش اور (بظاہر) بڑی سست خرام جدوجہد نے کیا نتائج پیدا کئے ہیں اس کا تصور ہم خود بمشکل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم پانی کے اندر غوطہ زن ہیں اس لئے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں۔ اس کی بابت اُس سے پوچھنا چاہئے جو ندی کے کنارے کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ وہ ہمیں بتائے گا کہ جب ہم نے آج سے تیس سال پہلے یہ آواز بلند کی تھی تو ہمارے ہاں قرآن کریم کا مصرف تلاوت برائے حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ لیکن آج ہر طرف سے آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ قرآن کریم ایک مکمل ضابطہ ہدایت ہے جو ہر زمانے میں اور انسانی زندگی کے ہر گوشے میں نوعِ انسانی کا خضرِ راہ بن سکتا ہے۔ میں

آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، زمیلاں محترم! کہ اتنے مختصر سے عرصہ میں جو قوموں کی زندگی میں لمحہ بھر سے زیادہ نہیں، اس بے سروسامانی کے باوجود ایک پورے ملک ہی میں نہیں، بیرون ملک تک کی فضا میں اس قدر انقلاب پیدا کر دینا، کچھ کم کامیابی ہے؟ میں تو عزیزانِ من! جب اس تبدیلی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو دلہانہ طور پر میری کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ۔

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا اور میں تو، بکمال عجز و نیاز بطورِ تحدیثِ نعمت، یہاں تک کہنے کی بھی جرات کر سکتا ہوں کہ صدرِ اول کے بعد، ہماری تاریخ کے کسی دور میں بھی، خالص فکرِ قرآنی کا اس قدر عالمگیر چرچا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ کیا آپ، مہبانِ گرامی قدر! اپنی اس سعادت کو وجہِ صدناز و باعثِ ہزار افتخار نہیں سمجھتے کہ جب، میدانِ حشر میں، حضور نبی اکرم ﷺ بدرگاہِ ایزدی، یہ لرزہ انگیز شکایت کریں گے کہ: نَبِیِّہٖ اِنَّ قَوْمِیْ اَتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (25:30)۔ ”اے میرے نشوونما دینے والے! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو ایک شے، مجبور بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔“ تو آپ کا شمار اُس قوم میں نہیں ہوگا جس کی طرف حضور ﷺ کی انگلی اُٹھے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ہزار کامرانیاں اور سرفرازیاں اس ایک استثناء پر نثار کی جاسکتی ہیں۔

لہذا، برادران! آپ ان تمام ہنگامہ خیزیوں اور شورش انگیزیوں سے صرفِ نظر کر کے، اپنی ان خاموش سرگرمیوں میں، اس یقینِ محکم کے ساتھ منہمک رہیں کہ اس وقت ساری دنیا میں صرف آپ کی یہ مختصر سی جماعت ہے جو پیغامِ خداوندی کی مئے بے درد و صاف کو شفاف اور بیرنگ پیمانوں میں پیش کر رہی ہے۔ یہ نہ سمجھے کہ فضائے عالم میں مختلف ہوائیں جس جس سمت کو چل رہی ہیں، میں اُن سے بے خبر ہوں۔“ یالات و مناتِ زمانہ جن نئے نئے لباسوں میں بھیس بدل کر وجہِ رہزنیِ ملتِ بیضابن رہے ہیں، وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ بالکل نہیں۔

رہا ہوں رند بھی اے شیخ، پارسا بھی میں مری نگاہ میں ہیں رندو پارسا ایک اور اس قسم کے مناظر بھی میرے سامنے رہتے ہیں کہ۔

گریباں میں ہیں، اور کچھ پھول بالوں میں سجائے ہیں چمن کو لوٹنے والے گلستاں بن کے آئے ہیں لیکن میں جوں جوں ان تحریکات کا مطالعہ اور اس قسم کے غارتگرانِ دین و دانش کا مشاہدہ کرتا ہوں، میرا یہ یقین، محکم سے محکم تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ جس راستے پر ہم گامزن ہیں، وہی فلاح و فوزِ انسانیت کی راہ ہے اور یہی وہ یقینِ محکم ہے جس کی بنا پر میں آپ احباب سے گزارش کروں گا کہ آپ اپنی مساعی کو نہ صرف بحال رکھیں بلکہ انہیں اور بھی تیز کر دیں، بالخصوص اس لئے کہ مذہبی پیشوائیت کی حرکتِ مذہبِ جوی سے فضا میں جو تکدر اور انتشار پیدا ہو رہا ہے اس سے، نوجوانِ تعلیم یافتہ طبقہ مذہب کی طرف سے اور بھی زیادہ متنفر ہوتا جا رہا ہے اور چونکہ صحیح اسلام (جو قرآن کے اندر ہے) ان کے سامنے لایا نہیں جا رہا، اس لئے ڈر ہے کہ جس طرح مغربی ممالک میں ہوا ہے، یہ طبقہ کہیں دہریت کے آغوش میں نہ چلا جائے۔ بنا بریں، آپ احباب کی ذمہ داری اس وقت اور بھی زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ اس وقت ذرا سی سہل انگاری معلوم منزل کو کتنی دور لے جائے۔

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر دامن کو ٹک ہلا کہ بجھی ہے دلوں کی آگ

طلوع اسلام کالج:

گذشتہ کنونشن پر آپ حضرات نے ایک عزم کیا جو بفضلِ ایزدی بڑا ہی راسخ ثابت ہوا۔ آپ نے طے کیا تھا کہ طلوع اسلام کالج کے قیام کے سلسلہ میں خصوصی کوششوں سے کام لیا جائے گا اور جب تک یہ اسکیم پایہ تکمیل تک نہیں پہنچے گی، آپ اطمینان سے نہیں سوئینگے۔ آپ کے اسی عزم بلند کا نتیجہ تھا کہ اس اسکیم نے ایک نئی کروٹ بدلی اور اس ایک سال میں اس سے ایسے تحیر انگیز نتائج برآمد ہوئے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تفصیل ان امور کی محترم سیکرٹری صاحب، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی اپنی رپورٹ میں آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ آپ کی ان مساعی جلیلہ اور ان کے اس قدر درخشندہ نتائج نے میری عمر کس قدر بڑھادی ہے، میں اس کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ اس سے میری ذات درمیان میں آجاتی ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے تصور کی درسگاہ کا قیام وقت کی ایک اشد ضرورت پوری کرنے کا نہایت اہم ذریعہ ہے۔ ایسا اہم کہ اس کے بغیر وقت کا وہ تقاضا جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا۔ عزیزانِ من! وقت کا دھارا بڑی تیزی سے بہہ رہا ہے۔ وہ انقلابات جو اس سے پہلے کہیں صدیوں میں جا کر رونما ہوا کرتے تھے اب شب و روز کا کھیل بن کر رہ گئے ہیں۔ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) جہاں اس قدر درگروں اور ستاروں کی گردش ایسی تیز ہو رہی ہے اور دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز اس شدت سے ہنگامہ خیز ہے کہ بڑے سے بڑے مدبر کی دُور رس نگاہ بھی یہ نہیں دیکھ سکتی کہ کل کیا ہوگا۔ تغیرات آندھیوں کی طرح آرہے اور جھکڑوں کی طرح جارہے ہیں۔

قدیم وجدید کا تصادم:

انقلاب آفرینیاں اس قدر عالمگیر ہیں کہ دنیا کا کوئی خطہ بھی ان کی زد سے محفوظ نہیں۔ خود ہمارے ہاں دیکھئے کہ اضطراب انگیز فسادات کے ہوش فراموش جناتی رقص نے کس طرح ملک کے امن و سکون کو نذرِ آتش کر دیا۔ یہ شعلے اب بھی بجھے نہیں محض وقت کی خاکستر کے نیچے دب گئے ہیں۔ یہ رقص درحقیقت آئینہ ہے اس تصادم کا جو اس وقت قدیم اور جدید میں ہر جگہ برپا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ۔

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

پُرانی سیاست گری خوار ہے زمین میر و سلطان سے بیزار ہے

قدامت پرستی کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس کے (بظاہر ایسے ایسے بڑے) شاہ بلوط اس جھکڑ کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے۔ وہ ان عالمگیر طوفانوں کا مقابلہ کر نہیں سکتے۔ فطرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو شے زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی زمانے کے تقاضے اُسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں۔ یہی ہوتا چلا آیا ہے، یہی اب ہو کر رہے گا۔ لیکن اس طرح

کے بے ہنگم تصادم سے ہوتا یہ ہے کہ جو درخت جڑے سے اکھڑتا ہے وہ زمین میں گڑھا پیچھے چھوڑ آتا ہے۔ اس کی جگہ پُر کرنے کے لئے کوئی نیا پودا وہاں نہیں اُگتا۔ یہ اس لئے کہ جسے ہم جدید کہتے ہیں وہ صرف قدامت پرستی کے جمود کا ردِ عمل ہوتا ہے غلط کی جگہ صحیح اور باطل کی جگہ حق لانے کا تعمیری منصوبہ نہیں ہوتا۔ اس وقت آپ دیکھئے۔ جدید کے پاس شورشیں ہیں۔ ہنگامے ہیں۔ تخریب ہے۔ فسادات ہیں۔ لیکن اس کے پاس غلط اور صحیح کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ایک قسم کے باطل کی جگہ دوسری قسم کا باطل آجائے گا۔ باطل کو مٹا کر اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنے کا کام صرف قرآن کریم میں عطا کردہ مستقل اقدار کی رُو سے ہو سکتا ہے میری نگاہِ عزیزانِ محترم! اس آنے والے تصادم کو دیکھ رہی تھی۔ اسی کے لئے میں نے قرآنی فکر کی تحریک کی بنیاد رکھی تھی کہ اگر ہم اس تصادم کے پیدا کردہ خلا کو عالمگیر حیثیت سے پُر نہ بھی کر سکیں تو کم از کم ایک خطہ زمین تو ایسا ہو جسے ہم زمانے کی ان تلاطم انگیزیوں میں کشتیِ انسانیت کے لئے روشنی کا مینار بنا سکیں۔ اس تحریک کی ایک اہم کڑی ایک ایسی درسگاہ کا قیام ہے جس میں ہم اس قسم کے نوجوان طالب علم تیار کر سکیں جن کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ: **وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ (6:122)**۔ وہ شمع قرآنی کو لے کر دنیا میں پھرینگے اور اس کی تاریکیوں کو اُجالے میں تبدیل کر دیں گے۔

اس مقام پر رفیقانِ محترم! میں ایک اور حقیقت کو بھی دہرا دینا چاہتا ہوں جسے میں نے ضمنی طور پر اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ پیش کیا ہے۔ لیکن آج میں اسے زیادہ واضح الفاظ میں اُبھار کر سامنے لانا چاہتا ہوں کہ۔

سینہ صافم قلندر مہستم رازِ خود را نہاں نمی گویم

مذہبی پیشوائیت اور اسلام:

اور وہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے کسی ایسے خطہ اور کسی ایسی قوم میں اسلام کا احیاء نہیں ہو سکے گا جہاں مذہبی پیشوائیت ایک موثر عنصر کی حیثیت سے موجود ہو۔ یہ میرا کوئی جذباتی ادعا نہیں، دلیل و برہان پر مبنی حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل کو ایسی اصطلاحات سے بہلا یا نہیں جاسکتا جن کا دو ٹوک، متعین، صاف اور واضح، ٹھوس مفہوم آپ ان کے سامنے پیش نہ کر سکیں۔ لیکن صورت یہاں یہ ہے کہ اسلام کو ایک مبہم اصطلاح کے طور پر صدیوں سے پیش کیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ اصطلاح اب اپنی کشش ہی کھو چکی ہے۔ آج بھی اسلامی نظام، اسلامی اندازِ زیست، اسلامی معاشرت، اسلامی معیشت، اسلامی حکومت جیسے الفاظ جس شد و مد سے دہرائے جاتے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن ان اصطلاحات کا کوئی متعین، دو ٹوک مفہوم کسی کی طرف سے بھی پیش کیا جاتا ہے؟ مذہبی پیشوائیت اس قسم کا مفہوم پیش کر ہی نہیں سکتی۔۔۔ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اس لئے کہ یہ لوگ بالمقصد ایسی پوزیشن رکھنا چاہتے ہیں جس میں جس وقت یہ کسی بات کو چاہیں اسلامی قرار دے دیں جس وقت چاہیں اس پر خلافِ اسلام ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیں۔ اگر اسلام کا متعین اور دو ٹوک مفہوم سامنے آجائے تو ان کا یہ اختیار و اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔ دین کا متعین مفہوم صرف خدا کی کتاب پیش کرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات اس کتابِ عظیم کو امت کے سامنے نہیں آنے دیتے۔ اب موجودہ تصادم میں ہوگا یہ کہ یہ حضرات اسی قسم کی مبہم اور غیر متعین باتوں سے

نوجوانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے لیکن موجودہ دور کا ذہن ان بہلاؤوں اور بہکاووں سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے برگشتہ ہوتا چلا جائے گا۔ انہیں سنبھالنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انہیں تعلیم اس قسم کی دی جائے جس سے دین کا متعین مفہوم اس کا واضح مقصد عرصہ حیات میں اس کا صحیح مقام اور اس کے نظام کے محسوس نتائج، دو اور دو چار کی طرح ان کے سامنے آجائیں۔ ہمارے پیش نظر جس درس گاہ کا قیام ہے اس کے نظام تعلیم کی عمارت انہی بنیادوں پر استوار ہوگی۔ اس سے رفیقانِ گرامی قدر! آپ اپنے مجوزہ کالج کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور اس امر کا بھی کہ اس کے قیام میں تاخیر کس قدر ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہوگی۔ بنا بریں میری آپ سے التجا ہے کہ آپ اس مرتبہ یہاں سے اٹھیے تو جھولیاں لیکر شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ کو چہ بہ کو چہ آستان بہ آستان چل نکلیے۔ اور واپس اُس وقت لوٹیں جب آپ اس کالج کے افتتاح کا انتظام کرنے کے قابل ہو جائیں۔ عمر کے اس آخری حصہ میں میری سحرگاہی دعائیں آپ کے شامل حال ہوں گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔۔۔

حرفِ آخر:

آخر میں میں آپ کی توجہ اُس بنیادی اصولِ حیات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے اقبال نے اُس قطعہ میں بیان کیا ہے جس سے میں نے اس خطاب کا آغاز کیا تھا۔ یعنی یہ کہ

اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

(مفہوم: اگر آج بھی تو گزرے ہوئے کل کی تصویر ہے، یعنی تیرا آج کل جیسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیرے جسم کی پٹی

میں زندگی کی چنگاری بجھ چکی ہے۔ س۔ ا)

اور یہ درحقیقت اعادہ ہے حضور نبی اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کا کہ: مَنْ اسْتَوَى يَوْمَآ فَهُوَ مَغْبُوتٌ۔ جس کے دو دن ایک ہی جیسے گزر جائیں وہ سخت نقصان میں رہا۔ زندگی کی کیفیتیں دوہی ہیں۔ یا آگے بڑھنا، یا پیچھے ہٹنا۔ جسے جمود یا ایک مقام پر کھڑے رہنا سمجھا جاتا ہے وہ درحقیقت رجعتِ قمری (پیچھے ہٹنا) ہوتی ہے اس لئے کہ اس اثناء میں زمانہ آگے بڑھ چکا ہوتا ہے اور آپ اپنے مقام پر کھڑے رہ کر صفِ زمانہ سے پیچھے رہ گئے ہوتے ہیں۔ ایک مقام پر جامدِ مردہ رہتا ہے۔ زندہ انسان ایک مقام پر نہیں رہ سکتا۔ بنا بریں رفیقانِ محترم! آپ جب یہاں جمع ہوں تو آپ کو اس امر کا جائزہ لینا اور اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ آپ کا قدم سالِ گذشتہ کے مقابلہ میں آگے بڑھا ہے یا نہیں۔ اگر آگے بڑھا ہے تو آپ کا شمار زندوں میں ہوگا۔ ورنہ ہم نفسِ شماری کو زندگی سمجھ کر اپنے آپ کو دھوکے میں رکھیں گے۔ خدا کرے کہ ہم خود فریبی کے اس ابلیسی پھندے میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اسے اچھی طرح سمجھ رکھئے کہ حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور آپ کی تو منزل ہی بہت دور ہے۔

ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!

سوشل میڈیا اور جمعہ مبارک

”جمعہ مبارک“ سوشل میڈیا پر جس تو اثر سے گردش کر

رہا ہے عین ممکن ہے آنے والے دنوں میں یہ جملہ مذہبی فریضہ کے طور پر ادا کیا جانے لگے۔ چنانچہ کوئی مسلمان جمعہ کی نماز ادا کرے یا نہ کرے لیکن اس پر واجب ہوگا کہ وہ جمعہ کی مبارک باد کا مہینج لازمی طور پر شیر کرے بصورت دیگر ایسا نہ کرنے والے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور کوئی شبہ نہیں کہ اس شخص کے اس غیر اخلاقی عمل (کچھ لوگوں کی نظر میں) پر فتویٰ بھی صادر کر دیا جائے۔

عزیزان گرامی ذرا سنجیدگی اور تدبر سے اگر سورہ لیلۃ القدر کا مطالعہ کیجئے تو حقیقت آپ پر آشکارا ہو جائیگی کہ اصل مبارک باد تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد اور نزول قرآن پر دینی چاہیے۔ جن کی تشریف آوری سے ظلمتوں کے سائے جو صدیوں سے زمین پر منڈلا رہے تھے بارضائے الہی اختتام پذیر ہوئے۔ دراصل نزول قرآن کے بعد ایک عملی مومن کے لیے زندگی کا ہر لمحہ باعث خیر و برکت اور لائق مبارک باد ہے۔ قرآن مجید کو پڑھیں سمجھیں عمل کریں اور اپنے عملی ثبوت کے ساتھ دوسروں کو بھی عمل کی تلقین کریں اس

میں ہی ہم سب کی بھلائی مضمر ہے۔ قرآن پاک کا نزول رمضان المبارک میں ہوا۔ اب جبکہ نزول قرآن کو 1444 سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے تو ہم اور آپ اسے طاق راتوں میں کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ قرآن مجید تو اللہ رب العزت کی رضا سے نازل ہو چکا ظلمتوں کے سائے چھٹ گئے اب تو اس میں موجود ہدایات الہی پر عمل کرنے کا وقت ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے کر کے دکھایا۔ ان کے منصفانہ اعمال کی بدولت آسمان دنیا اس کرہ ارض کو جنت نظیر بنا ہوا دیکھ چکی ہے۔ اب تو تجدید عہد کا وقت ہے۔ تاکہ ہم اپنا کھویا مقام اور عزت پھر سے بحال کر سکیں۔

نزول قرآن کی برکت سے ہزاروں مہینوں کا چھایا ہوا ظلم و بربریت کا اندھیرا چھٹ گیا۔ چشمہ رحمت و برکت ٹھاٹھیں مار رہا ہے کہ آؤ میں تمہاری دنیا سنو اردوں اور تمہیں حوض کوثر تک لے جاؤں۔ اب تو ہر ساعت ہر دن ہر رات اور آنے والے تمام ماہ و سال باعث رحمت و برکت ہیں اگر

غرض سے ہوتا تو پھر 23 نبوی سالوں میں 29 غزوات کی کیا ضرورت تھی۔ نوافل اور وظائف پر تکیہ کافی تھا کیونکہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد شروع ہونی ہے لہذا عقل و شعور کا تقاضا تو یہی ہے کہ غیر ضروری جانی اور مالی مشکلات سے اپنے آپ کو اور اپنے رفقاء کو دور رکھا جائے۔

لیکن آسمان دنیا نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے برعکس تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی 63 سالہ زندگی جہد مسلسل سے تعبیر ہے نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے حصول کے بعد بھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات رات بھر نوافل ادا کرتے تھے اور اپنی امت کی بخشش کے لئے اتنا گریہ کرتے تھے کہ داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھی۔ اگر ان تمام اقوال کو مان لیا جائے تو بحیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مانگی ہوئی کوئی دعا بارگاہِ الہی میں رد نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اب تو راوی کو چین ہی چین لکھنا چاہیے۔ کیوں کہ دنیاوی زندگی تو عارضی ہے اور بخشش کی دعا نبی پاک نے پہلے ہی کر دی تو جنت ہمارا مقدر ہے پھر یہ مشقت کس کام کی۔

اگر عقل و دانش سے کام لیا جائے تو بات بڑی سادہ ہے دراصل وہ رت جگے نوافل کی ادائیگی کے علاوہ اگلے دن کی حکمت عملی کے لیے زیادہ اہم تھے۔ جس طرح تعلیمی سرگرمیوں کے دوران ہمیں اگلے پیپرز کی تیاری کے لیے دن کے اوقات میں وقت نہیں ملتا لہذا ہم رات کی خاموشی میں اگلے پرچے کی تیاری کرتے ہیں۔ یہی عمل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا گیا کہ 23 سالہ دور نبوت اور 29 غزوات دن اور رات کا

احکام الہی پر عمل پیرا ہوا جائے۔ جدید علوم میں دیگر اقوام سے برتری حاصل کی جائے۔ خدائے واحد کو لاشریک نہ ماننے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے ان کو زندگی کے تمام علوم میں شکست فاش دی جائے۔ تب کہیں جا کے دین اسلام کا سارے عالم میں بول بالا ہوگا۔

اس وقت مسلمانوں کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ ارب سے زیادہ ہے۔ یہ ڈیڑھ ارب مسلمان پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں ہر جمعہ اجتماعی نماز بھی ادا کی جاتی ہے۔ سال میں ایک مرتبہ رمضان کے روزے رکھے جاتے ہیں۔ روزوں کے دوران تراویح کی باجماعت نماز ادا ہوتی ہے شبینہ منعقد ہوتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں قرآن پاک کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس ہی ماہ مبارک میں اربوں روپے کی زکوٰۃ دی جاتی ہے۔ ہر سال چھبیس سے تیس لاکھ مسلمان فریضہ حج ادا کرتے ہیں لاکھوں کی تعداد میں عمرہ کی ادائیگی اس کے علاوہ ہے۔ ان تمام عبادات کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہر لمحہ وطن عزیز پر اللہ کے نور کی برسات ہوتی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا۔ غربت چور بازاری کرپشن اور استحصال کا خاتمہ ہوتا۔ مگر ہوتا اس کے برعکس ہے ایک عالمگیر ذلت و رسوائی ہے جو کہ ہمارا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں۔

اس ذلت و رسوائی کی بنیادی وجہ وحی الہی پر عمل نہ کرنا قرآن کریم کا ہر مسلمان گھرانے میں موجود ہونا لیکن عمل سے اعراض برتنا۔ تمام دینی اعمال کا مقصد صرف حصول ثواب ہونا۔ یہ ہے وہ طرزِ عمل جس نے مسلمانوں کی زندگی کو جیتے جی جہنم بنادیا ہے خاص کر پاکستانی مسلمانوں کو۔ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر عمل صرف حصول ثواب کی

دورانیہ وہی تھا جو آج ہے۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ دن بھر جنگ جیسے اعصاب شکن مقابلے میں برسرِ پیکار رہا جائے اور دوسرے دن پھر سے بغیر کسی حکمت عملی کے میدان جنگ میں کودا جائے۔

وقت کے انتظار میں ہماری سینکڑوں نسلیں اپنے خالق حقیقی سے جاملیں اور جو باقی بچے ہیں وہ بھی تیار بیٹھے ہیں مگر مجال ہے اپنی اس روش سے ہم ایک انچ بھی آگے یا پیچھے ہٹے ہوں۔

بقول علامہ اقبال۔
مست رکھو ذکر و فکرِ صُبحا ہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے
(ہو سکے تو ایک مرتبہ اقبال کی تحریر کردہ ابلیس کی مجلس شوریٰ کا ضرور مطالعہ کر لیں)

اپنی ایک گزشتہ تحریر میں میں نے عرض کیا تھا کہ احکام الہی کی پابندی نہ کی گئی تو اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے وہ کسی دوسری قوم کو آپ پر مسلط کر دے گا اور اس ذات با صفات نے مسلط کر بھی دیا مگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں۔ قانون خداوندی اٹل ہے بے شک ہم اس سے اعراض برتتے رہیں۔ نوشتہ دیوار ہمارے سامنے ہے ہماری چشم پوشی سے وہ تحریر مٹ نہیں سکتی۔

کیا ہمیں جنگ بدر کی تاریخی حکمت عملی یاد نہیں، جنگ خندق کا معرکہ یاد نہیں، کیا یہ تمام جنگیں بغیر حکمت عملی کے لڑی گئیں۔ جنگ احد میں حکمت عملی پر عمل پیرا نہ ہونے کے نقصانات ہمیں یاد نہیں؟ ایسا بالکل نہیں ہمیں سب کچھ بہت اچھی طرح یاد ہے لیکن ہم نے دیدہ دانستہ اپنی شعوری آنکھ کو بند کر لیا ہے۔ اور اپنے تمام تر جرائم کا ملبہ ذات باری تعالیٰ پر ڈال دیا یہ کہہ کر کہ اللہ کو یہی منظور تھا۔ اور پھر آس لگائے بیٹھے ہیں کہ پہلے امام مہدی علیہ السلام تشریف لائیں گے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے کفار کے ساتھ گھمسان کا رن پڑے گا، مسلم آبادی سمٹ کر شہر مدینہ تک محدود ہو جائے گی اور پھر اسلام کو غلبہ نصیب ہوگا۔ لہذا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں صرف اس وقت کا انتظار کریں جس

سانحہ ارتحال

اطلاع دی جاتی ہے کہ بزم طلوع اسلام راولپنڈی کے دیرینہ رکن عبدالحق مختصر علالت کے بعد وفات پا گئے ہیں۔ چند سال قبل محکمہ تعلیم سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وہ اپنے کردار، مبنی بر خلوص کی بناء پر اپنے شاگردوں اور ساتھیوں میں خاص پہچان اور مقام رکھتے تھے اور احباب بزم کے لئے ایک اثاثہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا جنازہ ان کے آبائی گھر چکوال سے اٹھایا گیا تھا۔ ان کے جنازہ میں اراکین بزم ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ، امجد محمود، عابد حسین، اورنگزیب اور ملک فدا حسین شریک ہوئے۔

بزم راولپنڈی دیرینہ ساتھی کی کمی محسوس کرتی رہے گی۔ ہم مرحوم کی بلندی درجات کے لئے دعا گو ہیں اور ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔
نمائندہ بزم راولپنڈی ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

نظریہ مادیت انسان کی جسمانی حیوانی زندگی کا آخری ارتقائی مقام

علم نفسیات میں انسان کی جسمانی / حیوانی زندگی گزارنے کی روش میں جبری طور پر جبلت اور احساس کا عمل دخل ہوتا ہے، جبکہ انسانی ذات آزادی ارادہ اور عقل سے کئے گئے اعمال پر مبنی ہوتی ہے۔ اس باب میں ہم علم نفسیات کے تحت احساس پر مبنی جبلت انسان کی جسمانی / حیوانی زندگی کی کیفیت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

انسان کی حیوانی زندگی پر احساس کا کردار:

حیوان میں صرف احساس کی صفت ودیعت کی گئی ہے جبکہ انسان کو اس کے ساتھ عقل و شعور کی صلاحیت بھی ودیعت کی گئی ہے۔ احساس ہماری ذہنی زندگی کا جزو لا ینفک ہے۔ ہر حس ہمیں خارجی دنیا سے واقف کرنے کے علاوہ خوشگوار یا ناخوشگوار بھی محسوس ہوتی ہے۔ ٹھنڈے پانی کے پلے کے مطابق ہم مہیچات کے لیے صرف حس ہی نہیں رکھتے بلکہ اُن کا احساس بھی رکھتے ہیں۔ ہمیں حواس کی بدولت بیرونی اشیاء اور ہمارے اجسام کے متعلق صرف واقفیت ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ خوشگوار یا ناخوشگوار دونوں کا تجربہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ شعوری زندگی کے ہر لمحہ میں ہم خوش ہوتے ہیں یا ناخوش ہمارا رجحان غیر جانبدارانہ کبھی نہیں ہوتا۔

ونٹ تحسیس کی چھ اقسام پر مبنی درج ذیل جوڑے گنواتا ہے۔

1۔ خوشگوار یا ناخوشگوار 2۔ تناؤ اور آسودگی 3۔ جوش اور ضمحل

اس کے برعکس احساس دونوں حس + تحسیس کے مربوط اور مرکب ذہنی عمل ہے جو تحسیس پر مشتمل ہوتا ہے۔ فلسفہ میں احساس کی اصطلاح کا مفہوم قدر آفرینی کا داخلی عمل، پسند یا ناپسند کرنا، ترجیح دینا ہے۔

احساس اور حس دونوں ابتدائی ذہنی اعمال ہیں، تاہم اُن میں درج ذیل اختلافات پائے جاتے ہیں۔

1۔ حواس کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ان میں حواسِ خمسہ بصری، سمعی، لمسی، شامہ اور ذائقہ اہم ہیں، لیکن احساسات دو ہی

قسم کے خوشگوار یا ناخوشگوار ہوتے ہیں۔

2- حواس میں کیفیت، شدت، مدت اور وسعت کے چار پہلو پائے جاتے ہیں، لیکن احساس میں چوتھا وسعت کا پہلو نہیں پایا جاتا ہے۔ خوشی یا ناخوشی میں شدت اور مدت کا فرق ہو سکتا ہے، مگر وسعت کا پہلو نہیں ہوتا۔

3- ایک ہی پیغام ہمیشہ ایک ہی حس پیدا کرتا ہے۔ مگر ایک ہی پیغام سے پیدا شدہ احساس نہ صرف مختلف ہوتا ہے، بلکہ ایک ہی فرد میں بھی مختلف اوقات میں مختلف ہوتا ہے۔ آگ ہمیشہ ایک جیسی حرارت کی حس پیدا کرتی ہے، مگر ہمیشہ ایک جیسا احساس پیدا نہیں کرتی۔ سردیوں میں یہ خوشگوار اور گرمیوں میں ناخوشگوار احساس پیدا کرتی ہے۔

4- حواس کا ہم باطنی مشاہدہ کر سکتے ہیں، مگر احساسات کا باطنی مشاہدہ نہیں ہو سکتا اور اسی لیے وہ بیان بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ حواس ہمیں خارجی اشیاء کا علم دیتے ہیں، جن کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، لیکن احساسات کا تعلق ہماری اندر کی ذات سے ہوتا ہے اور وہ ہمیں ذاتی علم دیتے ہیں۔ حواس کی بدولت ہم جانتے ہیں کہ کوئی شے کیا ہے اور احساسات ہمیں بتاتے ہیں کہ کوئی شے ہم پر کس طرح اثر پذیر ہوئی۔

علم نفسیات کے ماہرین نے انسان کی جسمانی/ حیوانی زندگی گزارنے کے لئے اللہ کی طرف سے جبلت و دیعت کی گئی ہے، جس کی پابندی کرنے میں وہ مجبور ہوتی ہے۔ ان جبلتوں کو درج ذیل تین کیفیتوں پر مبنی نظریات میں تقسیم کر کے انسان کی جسمانی/ حیوانی زندگی کے ارتقائی عمل کو واضح کر کے ہماری راہنمائی کی جاتی ہے۔

1- جبلت کی کیفیات کا نظریہ

2- ہيجان کی کیفیات کا نظریہ

3- جذبات کی کیفیات کا نظریہ

ان سبھی نظریات کو ترتیب وار بیان کرتے ہوئے، اُن میں سے پہلے ہم نظریہ جبلت کا جائزہ لیتے ہیں۔

نظریہ جبلت کی کیفیات کا نظریہ:

علم النفسیات کے حوالہ سے جبلت کا لغوی مفہوم ایک خلقی خود کار تحریک ہے، جو انسانوں اور حیوانوں میں بنیادی حیاتیاتی ضرورتوں کی تسکین کے لیے با مقصد اور ہدایتی رویہ پر منتج ہوتی ہے۔ ایک غیر اختیاری رجحان یا تحریک جو خاص حالات میں خاص انداز سے عمل کرتی ہے اور اُسے کسی چیز کی فطری صلاحیت کا نام دیا جاتا ہے۔ نفسیات میں جبلت کی تعریف میکڈوگل کے حوالے سے کیا جاتا ہے کہ وہ موروثی، طبعی اور نفسی میلان جو مخصوص قسم کے مہیجانات سے بیدار ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہ فرد میں مخصوص قسم کا ہيجانی اشتعال اور اس (ہيجانی اشتعال) کی مناسبت سے خاص قسم کے عمل کے مرتکب ہونے کی طلب پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح جبلی کردار کسی جبلت کے مشتعل یا بیدار ہونے کے نتیجہ میں وجود آنے والا غیر اکتسابی اور اضطراری کردار جیسا فعل ہے، جو سیکھنے اور تربیت کا نتیجہ نہ ہو۔

فلسفہ میں جبلت عضویہ کے مخصوص مہيج کی موجودگی میں معروض کا ادراک کرنے، اس سے متاثر ہونے، اس کی جانب یا

خلاف عمل کرنے کا خلقی، غیر اکتسابی یا وہبی میلان ہوتا ہے۔ فلسفہ ہی کی شاخ نظریاتی نفسیات کے حکمائے قدیم حیوانوں کی حرکات کو جبلی، لاشعوری اور میکاکی قرار دیتے تھے اور انسانوں کے افعال کو جبلی، شعوری اور ارادی گردانتے تھے اس کی تائید پروفیسر بُرہان احمد فاروقی کی تحریرات میں دیکھی جاسکتی ہے اس کے برعکس جدید علمِ حیاتیات کے ماہرین انسانوں اور حیوانوں کے باہمی جبلی رشتہ پر زور دیتے ہیں اُن کا عقیدہ ہے کہ حیوانوں کی طرح بیشتر انسانوں کا کردار بھی بڑی حد تک جبلی رجحانات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ جانوروں کے اندر ایسی قوت ہے، جو بغیر کسی ارادہ کے کام کرتی ہے اور خارجی عمل کے رد عمل کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ رد عمل بالعموم مستقل نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ جبلت میں ان صفات کے پائے جانے کا انکشاف ہوتا ہے۔

1۔ جبلت موروثی اور پیدائشی ہوتی ہے۔

2۔ یہ اکتساب یا سیکھنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ورثہ میں ملتی ہے۔

3۔ یہ شعور میں نہیں بلکہ لاشعور میں موجود ہوتی ہے اور اشتعال کی حالت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس تعلق کو واضح کرنے کے لیے میکڈوگل تالے اور چابی کی تمثیل پیش کرتا ہے۔ جس طرح ایک تالہ ایک مخصوص چابی سے کھلتا ہے اسی طرح ایک جبلت اپنے مخصوص مہیج سے مشتعل ہوتی ہے۔

4۔ ہر فرد کی زندگی میں جبلت کا ہونا لازمی ہے۔

5۔ جبلت بذاتِ خود بے اختیاری اور میکاکی ہوتی ہے ”ارادی“ نہیں ہوتی۔

6۔ ہر جبلت کا کوئی مقصد ہوتا ہے مگر وہ مقصد شعوری ذہن میں نہیں ہوتا ہے۔

نظریہ جبر میں جہاں تک انسان کی طبعی یا مادی زندگی یعنی حیوانی زندگی کا تعلق ہے، وہاں میکاکی یا جبلی طاقتیں کارفرما ہوتی ہیں اور ان ہی کی اطاعت کرنے کی انسان کو عادت ہو جاتی ہے۔

جبلت اور عادت میں فرق:

جبلت اور عادت بظاہر مترادف معانی کے حامل ہوتے ہیں اور وہ دونوں ایک ہی قسم کا عمل کرتے ہوئے ہی دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان میں نمایاں فرق بھی پایا جاتا ہے۔ ان کو مترادف معانی میں اس لیے لیا جاتا ہے کہ جبلت اور عادت دونوں ایسے اندرونی میلانات یا رجحانات ہیں جو میکاکی افعال کی شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اُن دونوں میں افعال کم و بیش ایک ہی انداز میں سرزد ہوتے ہیں اور دونوں میں شعور کی موجودگی غیر اہم ہوتی ہے۔ مشہور مقولہ العادت طبع ”ثانیہ“ کی رو سے طبیعتِ اولیٰ یعنی جبلت پر اضافہ کر کے اُسے ہی طبیعتِ ثانیہ یا عادت کا نام دیا جاتا ہے۔ البتہ جبلت اور عادت میں درج ذیل نمایاں امتیازات بھی نظر آتے ہیں کہ:

i۔ جبلت میں تبدیلی ممکن نہیں ہوتی لیکن عادت میں تبدیلی کی قوت موجود ہوتی ہے۔

ii۔ جبلتوں میں آموزش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جانور سیکھے بغیر کے جنسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر عادات سیکھنے سے آتی ہیں، جو حیوان اور انسان حالات کا جائزہ لے کر سیکھتے ہیں۔

iii۔ ایک نوع کے تمام افراد میں کم و بیش ایک جیسی جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ان کی عادات مختلف ہوتی ہیں۔

iv۔ جبلت کے اعمال میں میلانات کا ہونا ضروری نہیں ہوتا جبکہ عادت میں میلانات کو قبول کرنا ضروری ہے۔ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں کہ جبلت اور عادت، حیوانوں اور انسانوں دونوں میں موجود ہوتی ہیں لیکن نوع میں فرق ہونے کی وجہ سے وہ انسانوں میں حیوانوں سے ایک جداگانہ اور ممتاز مقام رکھتی ہیں۔

یہ امر ثابت کرنا آسان ہے کہ انسان بھی حیوانوں کی طرح جبلتیں رکھتا ہے۔ مگر اس کی جبلتوں کا گونا گونا آسان نہیں۔ حکمائے نفسیات انسانی جبلتوں کے متعلق مختلف نظریات اور پیش کرتے ہیں۔

انسان کی حیوانی زندگی میں جبلتوں کی جماعت بندی کی تشکیل:

بعض حکماء جبلتوں کی کم سے کم تعداد کے قائل ہیں اور بعض جبلتوں کی تعداد کو بہت بڑھا دیتے ہیں۔ انسانی جبلتوں کی میکڈوگل کی جماعت بندی اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس کے خیال میں ان کی تعداد چالیس سے کم نہیں ہے، لیکن اس نے سات اہم جبلتوں کی موجودگی نشانہ ہیوں کی ہے۔

1۔ جبلت فرار (Instinct of Plight) یعنی اپنی بقا کی خاطر انسان کا خطرات سے فرار اختیار کرنا۔

2۔ جبلت تنفر (Instinct of Repulsion) یہ بدبودار اور بد ذائقہ اشیاء کے اثر سے بیزاری کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔

3۔ جبلت تجسس (Instinct of curiosity) یہ عجیب و غریب شے سے مشتعل ہو کر اس کا مشاہدہ کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ ماحول اور کسی نئی اور انوکھی چیز کی تفہیم پر آمادہ کرتی ہے۔

4۔ جبلت نزاع پسندی (Instinct of Pugnacity) اس کا کوئی خاص مہیج نہیں ہوتا۔ یہ جبلت ہر جبلی فعل کے راستے میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے سے بیدار ہو سکتی ہے۔ خصوصاً دشمن سے مقابلے کی صورت میں۔

5۔ جبلت خود ادعائی اور تحقیر نفس (Instinct of self-assertion and Self-abasement) یہ دوسروں کی موجودگی میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے خود ادعائی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جبکہ اپنے سے بہتر اشخاص کے سامنے عجز و انکسار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

6۔ والدینی جبلت (Parental instinct) اس جبلت کے باعث ماں بچوں کو پالتی ہے۔ عام طور پر نر کی نسبت مادہ میں یہ جبلت شدید ہوتی ہے۔

7۔ جبلت جنسی (Sex instinct) یہ مخالف جنس کی موجودگی میں بیدار ہوتی ہے۔ اور افزائش نسل کے لیے ضروری ہے۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہر انسان چند بنیادی رجحانات کے عمل اور احساس کے موروثی محرکات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ درج بالا بنیادی اہم جبلتوں کے علاوہ میکڈوگل نے مندرجہ ذیل ثانوی جبلتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

1۔ جبلتِ گروہ بندی:

یہ انسان میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے، جس کے باعث ہم جلسے، جلوسوں، کھیلوں اور میلوں میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جبل کی کوٹھری سے انسان اس لئے بھی گھبراتا ہے کہ تنہا رہنے سے اس کی گروہی جبلت کی تسکین نہیں ہوتی۔

2۔ جبلتِ حصول:

اس جبلت کے باعث انسان اپنی چھوٹی عمر میں ٹکٹ اور سکے اور بڑی عمر میں دولت جمع کرتا رہتا ہے۔

3۔ جبلتِ تعمیرات:

اس کا مظاہرہ بچوں کے مٹی کے گھر بنانے اور کھلونے بنانے سے شروع ہو کر فن تعمیر تک پہنچتا ہے۔ یہ جبلتیں انسانی عضویہ یا کم از کم انسانی نسل کے بقاء اور تحفظ کا وظیفہ انجام دیتی ہیں۔ لیکن فرد کو اس حقیقت کا شعور نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جسمانی یا ذہنی اعمال و معمولات سے واقف نہیں ہوتا۔ یہ عمل کے میلانات ہیں اور ہم انہیں صرف ان کے پیدا کردہ اعمال ہی کے ذریعہ سے پہچانتے ہیں۔

ہم نے دیکھا ہے کہ جبلتیں اپنے مقاصد رکھتی ہیں اور وہ موروثی رجحانات سے پہچانی جاتی ہیں۔

جبلت کے تین بنیادی مقاصد:

پروفیسر مارشل نے جبلت کے درج ذیل تین بنیادی مقاصد کی نشاندہی کی ہے، جن کا ہم یہاں ترتیب وار جائزہ لے رہے ہیں۔

2۔ جذبہٴ تغلب (Self Aggression)

1۔ جذبہٴ بقاء (Self Preservation)

3۔ جذبہٴ بقاءِ نسل (Self Procreation)

1۔ جذبہٴ بقاء (Self Preservation):

جذبہٴ بقاء کے بنیادی مقاصد کے حصول میں میکڈوگل کی بیان کی گئی درج سات جبلتوں میں چار جبلتیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ ان میں جبلتِ فرار، جبلتِ تجسس، جبلتِ تنفر اور جبلتِ نزاع پسندی شامل کی جاتی ہیں، جو ہمارے جذبہٴ بقاء میں بھوک، پیکار، فرار اور کھیل کے ذریعہ سے ہماری توجہ مبذول کراتی ہیں۔

2۔ جذبہٴ تغلب (Self Aggression):

اس کے بنیادی مقاصد کے حصول میں جبلتِ خود ادعائی اور تحقیر نفس کی دو جبلتیں شامل کی جاتی ہیں۔ وہ انسان کا اجتماع میں قائم جبلتوں بزم آرائی، مقبول ہونے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے ذریعہ سے ہماری توجہ مبذول کراتی ہیں۔

3۔ جذبہ بقاء نسل (Self Procreation):

اس کے بنیادی مقاصد میں اُوپر درج سات اہم جبلتوں میں دو جبلتوں، جبلت والدینی اور جبلت جنسی کی دو جبلتیں شامل کی جاتی ہیں۔ میکڈوگل مزید کچھ اور جبلتوں مثلاً والد اور والدانہ شفقت کے ذریعہ سے ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ یہ سبھی جبلتیں انسانی عضویہ یا کم از کم نسل انسانی کے بقاء اور تحفظ کا وظیفہ سرانجام دیتی ہیں۔ لیکن فرد کو اس کا شعور نہیں ہوتا، کیونکہ یہ جسمانی یا ذہنی اعمال نہیں ہیں۔ بلکہ یہ فعل کے جلی میلانات ہیں۔ اور ہم انہیں صرف ان کے پیدا کردہ افعال ہی کے ذریعہ سے پہچان سکتے ہیں۔ لہذا حکماء کا خیال ہے کہ انسان کی ساری فطرت یا اس کے اعمال کا مآخذ یا منبع اس کی حیوانی جبلتیں ہی ہیں۔ اور وہ اپنے افعال کی ادائیگی میں مجبور محض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی مادی نظریہ حیات ہے جس کی رو سے انسان کے طبعی مادی پیکر ہی کو زندگی کے ارتقاء کی آخری کڑی سمجھا جاتا ہے۔

علم نفسیات کی رو سے انسان کی حیوانی زندگی کی شخصیت کا تعین داخلی کیفیتوں سے کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ، انسان کو جبلتوں عادتوں اور احساسات کا نظام سمجھتا ہے جو انسان کو حوائج، محرکات اور خواہشات کے مربوط نظام میں باندھتا ہے اور ہمیں ماحول کے مطالعہ، استعمال اور تسخیر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ شخصیت کا یہ نقشہ انسان کی حیوانی زندگی بسر کرنے میں کردار کو جبلی، لاشعوری اور غیر ارادی، میکاکی، انداز میں اپنایا جاتا ہے۔ اس نقشہ میں انسان کے عقلی پہلو پر نہیں، بلکہ احساسی پہلو کی وضاحت ملتی ہے۔ علم النفسیات بنیادی طور پر نباتات کی ضروریات کے لیے احتیاج، جانوروں کے لیے اشتہا اور انسانوں کے لیے خواہش یا جذبات کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ نباتات میں صرف احتیاجات ہوتی ہیں۔ انہیں رجحان اور غایت دونوں کا شعور نہیں ہوتا۔ جانوروں میں احتیاجات اور اشتہا، دونوں موجود ہوتے ہیں اور رجحان کا شعور کا احساس بھی کسی قدر ہوتا ہے لیکن انہیں غایت کا علم نہیں ہوتا۔ انسانوں میں احتیاجات، اشتہا اور خواہشات تینوں ہی موجود ہوتی ہیں اور انسانی خواہش میں رجحان اور غایت دونوں کے متعلق شعور ہوتا ہے۔ وہ خواہشات پوری کرنے کے ذرائع کے حوالہ سے جائز اور درست کی تمیز بھی رکھتا ہے۔ اس بنا پر پروفیسر میکینزی انسانی خواہش اور حیوانی اشتہا کے ذریعہ انسان کے اندر انسانی اور حیوانی تقاضوں میں مندرجہ ذیل فرق بیان کرتا ہے۔

1۔ اشتہا میں غایت کا شعور نہیں ہوتا، جذبات یا خواہش میں غایتی شعور کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس غایت کو حصول خیر کا ضروری ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

2۔ اشتہا جبلی اور فطری میلانات کا نام ہے، جذبات یا خواہش عقلی اور اکتسابی شے ہوتی ہے۔

3۔ اگر خواہش پایہ تکمیل کو پہنچ جائے تو لذت کا موجب بنتی ہے اور اگر پوری نہ ہو سکے تو وہ الم کا باعث، لیکن خواہش میں انسان کے لیے لذت و الم اتنی اہم نہیں جتنی جانوروں کی اشتہا میں ہے۔

ڈاکٹر فیج الدین اس کی وجوہات یوں گنواتا ہے کہ:

1- ایک حیوان کے سارے افعال جبلتوں کے ماتحت وقتی تکمیل کے لیے سرزد ہوتے ہیں۔
 2- جبلت عمل کرنے کا ایک خاص اندرونی حیاتیاتی دباؤ ہے جس کے لیے حیوان کے نظامِ عصبی یا دماغ میں خاص مراکز موجود ہوتے ہیں۔ ایک حیوان اسی صورت میں غذا کی تلاش پر آمادہ ہوتا ہے جب اسے بھوک کی تڑپ محسوس ہو۔ جوں ہی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے وہ فکر فردا سے مستغنی ہو کر بیٹھ رہتا ہے اور پھر اس وقت چونکتا اور روبہ عمل ہوتا ہے جب اس کا نظامِ عصبی دوبارہ غذا کی طلب محسوس کرے۔

3- یہ جبلت کی قدرتی فعلیت، ایک خاص اندرونی یا بیرونی تحریک کے ماتحت ایک خاص مدعا کے ساتھ اور ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت یا عاطفہ و ہیجان (Emotion) کی ہمراہی میں شروع ہوتی ہے اور جب تک مدعا حاصل نہیں ہو جاتا برابر جاری رہتی ہے۔

4- جبلتوں کے عمل کی قدرتی غرض یہ ہے کہ فرد کی حیوانی زندگی اور نسل باقی رہے۔
 5- انسان کے اندر وہی جبلتیں ہوتی ہیں جو اس سے نچلے درجہ کے حیوانات میں موجود ہوتی ہیں کیونکہ جہاں تک بقائے حیات اور نسل کا تعلق ہے تو اس حوالہ سے انسان کی ضروریات بالکل وہی ہیں جو حیوان کی ضروریات ہیں۔
 علمِ نفسیات کا موقف ہے کہ یہ عقل و خرد سے کام نہ کرنے والی اشتہا کے تحت طبعی حیوانی زندگی جبر کے تحت گزاری جاتی ہے، جسے علم کے میدان میں تین گوشوں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

طبعی/حیوانی زندگی گزارنے کے تین جبری نظریات

جبر کے تحت طبعی اور حیوانی زندگی گزارنے کے تین جبری زاویہ نگاہ بتائے جاتے ہیں۔

1- علم الحیات کا جبری نظریہ

2- علم الانسان کا جبری نظریہ

3- علم النفسیات کا جبری نظریہ

1- علم الحیات کی رو سے انسانی عادات و خصائل کے نقوش بچے کو نفسیاتی طور پر نہیں ملتے بلکہ جس طرح ایک بچہ مادہ تولید کی وساطت سے اپنی رنگت و خد و خال، ماں باپ سے وراثت میں لیتا ہے اسی طرح اسے مادی طور پر ایسے اجزاء وراثت میں ملتے ہیں جنہیں جینز کہا جاتا ہے اور جن سے اس کا مزاج ترتیب پاتا ہے۔

اس نظریہ میں اب ذرا سی تبدیلی کی گئی ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ یہ اجزاء تولیدی درحقیقت خام مسالہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ پر ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے۔ یعنی بچہ کا مزاج مرکب ہوتا ہے، جو وراثتی مسالہ اور ماحول کے میکاکی اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس بارے میں ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ وراثت کے نقوش امنٹ ہوتے ہیں، جبکہ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں۔ ان

نقوش کو ماحول کی تبدیلی سے بدلا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماحول اور وراثت کے نقوش اور خصوصیات میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ انسان کی ہر ایک عادت اور خصوصیت مرتب کرنے میں وراثت اور ماحول دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔

2۔ علم الانسان کا جبری نظریہ

علم الانسان کی رو سے انسانی بچے کے ذہنی نقوش، معتقدات اور تصورات انفرادی چیز نہیں ہیں بلکہ وہ نسلی ہوتے ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہے جسکی ابتداء قبائل سے ہوتی ہے۔ نسلی معتقدات اور تصورات وراثت کے ذریعہ سے ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں اور انہی کے مجموعی تاثرات کا نام ایک فرد کے ذاتی خصائص اور رجحانات ہوتے ہیں۔

3۔ علم النفسیات کا جبری نظریہ

علم نفسیات میں نظریہ کرداریت کا بھی اپنا ایک موقف ہے جس کا امام ڈاکٹر وائسن ہے۔ اُس نے اپنی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ کا اعلان کیا کہ جسے ہم نفسِ انسانی کا فیصلہ کہتے ہیں، وہ درحقیقت آزاد فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ مجموعی نتیجہ ہوتا ہے، ان تمام محرکات کا جو بچے کے (نفس) ذہن پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ انہی محرکات سے نفسِ انسانی کی عادات اور خصائص مرتب ہوتے ہیں اور یہ عادات و خصائص نسلاً بعد نسل بطور وراثت منتقل ہوتے ہوئے غیر شعوری طور پر مسلمات یا معتقدات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بنا بریں جس چیز کو نفسِ انسانی کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ ان ہی محرکات کا طبعی نتیجہ ہوتا ہے۔

جب بھی جبلی میلانات اپنی جبلتوں سے متاثر اور مشتعل ہو کر زیادہ فعال ہونے کے مُرتکب ہوتے ہیں، تو اُن کے احساسات کی تبدیلی کو نفسیات میں ہیجان کا نام دیا جاتا ہے، جو وضاحت کا متقاضی ہے۔

انسان کی حیوانی زندگی کا جبلتوں سے مشتعل ہیجانی کیفیات کا نظریہ:

جدید حکمائے نفسیات ہیجان کو جبلت کا ہی احساسی پہلو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ہیجان جبلت ہی کے مشتعل ہونے پر معرض وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ ہر ہیجان کی بنیاد جبلی ہوتی ہے۔ اس لیے اُنہوں نے ہر بنیادی جبلت کے مشتعل ہونے پر درج ذیل بدلتی ہیجانی حالتوں سے واضح کیا ہے۔

- 1۔ جبلت فرار سے مشتعل حالتِ ہیجان خوف میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
- 2۔ جبلت تنفر سے مشتعل حالتِ ہیجان کراہت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
- 3۔ جبلت تجسس سے مشتعل حالتِ ہیجان حیرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
- 4۔ جبلت نزاع پسندی سے مشتعل حالتِ ہیجان غصہ میں تبدیل ہو جاتی ہے
- 5۔ جبلت خود ادائیگی اور تحقیر نفسی سے مشتعل حالتِ ہیجان احساسِ برتری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
- 6۔ والدینی جبلتِ ترحم سے مشتعل حالتِ ہیجان احساسِ کمتری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

7۔ جبلتِ جنس سے مشتعل حالتِ ہیجانِ شہوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
 ان تبدیلیوں کی حالت سے واضح ہوتا ہے کہ جبلتِ ذہن کا ایک مستقل رجحان ہے مگر ہیجان ایک عارضی کیفیت ہے۔
 اس سے مراد عضوے کی ایسی براہِ یجنہ کیفیت ہوتی ہے، جس میں خود اختیاری نظامِ عصبی (غدد، عضلات) درجہ اعتدال سے زیادہ فعال ہوتے اور مخصوص قسم کے جسمانی مظاہر مثلاً خون کے دباؤ، حرکتِ قلب اور تنفس میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔
 اس سے مراد احساسات کا فوری شدید اُبال ہوتا ہے اور وہ انسان کی حیوانی محرکِ فعل ہونے کا کام کرتا ہے۔
 احساس کی جبلت سے مشتعل ایسی ہیجانی کیفیت کی زندگی کے لیے قرآنی اصطلاحِ لہوٰی کے ذریعہ سے وضاحت کی گئی ہے۔

قرآن کا ہیجان پر مبنی زندگی گزارنے کی کیفیت کا ”لہوٰی“ کی اصطلاح کے اظہار سے وضاحت:-
 امامِ راغب نے لہوٰی کے معانی اوپر سے نیچے گرنے کے کیے ہیں۔ یہ ہیجانی کیفیت انسان کو اس کے شرف و منزلت سے گرا کر پست حیوانی خواہشات کے مصائب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔
 قرآن سے بھی ہمیں اس حیوانی ہیجانِ قرآنی اصطلاحِ اہواء کی جبلت سے مشتعل بلا لگام لاشعوری ہیجانی کیفیات کی زندگی کی بارے میں کہا گیا ہے کہ:

وَإِنَّ كَثِيرًا لَّيُضِلُّونَ بِأَهْوَاءِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (6:119)

”ایسے لوگوں میں سے بیشتر وہ ہیں، جنہیں اپنے ذاتی ہیجانی روش پر چلنے کی بنا پر علم (وحی) کی سند حاصل نہیں ہوتی اور وہ لوگوں کو صحیح راستے سے بہکا دیتے ہیں۔“

جو لوگ اپنے جبلّی جذبات پر اپنی عقلِ فعال سے قابو نہیں کر پاتے، ایسی حالت میں قرآن میں اُن کی کیفیات یوں بیان کی جاتی ہے کہ:

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (7:176)

”اگر وہ ہماری مشیت کے مطابق چلتا، تو ہم اسے بلند یوں کی طرف لے جاتے، لیکن ذاتی ہیجانات پر مبنی علم کے تحت وہ اپنی معاشی مفاد پرستیوں (ارض) کے ساتھ چمٹا رہا۔“

قرآن یہاں وضاحت کرتا ہے کہ اللہ کی خواہش کے برعکس، ان میں سے اکثر افراد اپنی سرکش خواہشات کی اتباع کر کے زمین کی پستیوں کے ساتھ جا چکے ہیں۔ لہذا قرآن مومنین کو ہدایت کرتا ہے کہ جب تمہارے پاس وحی کی روشنی میں واضح راستہ سامنے آ گیا ہے تو ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ (28:50)

”اور اس سے زیادہ گمراہ کون جو اللہ کی ہدایت کے برعکس اپنی ہیجانی خواہش پر چلے قرآن ان کے درجات بلند کرتا

ہے، جو خدا کی طرف سے علم و برہان کے مطابق چلے، ان کے مقابلے میں جو اپنی خواہشات کا اتباع کرے۔“

أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (47:14)

”کیا وہ شخص برابر ہو سکتا ہے، جو خدا کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں سیدھے راستے کی طرف جا رہا ہو، اس کے مقابلہ

میں جو بُرے اور بھلے کی تمیز کھو کر اپنے ہیجانی جذبات کا اتباع کرے۔“

یہاں قرآن الانسان کی خاص اس حالت کا نقشہ کھینچ رہا ہے۔ جب وہ حیوانوں کی مانند اپنی جبلتوں کے احساس سے مشتعل ہو کر ہیجانی زندگی گزارتا ہے، جس میں نہ تو وہ عقل سے کام لیتا ہے اور نہ ہی اپنی آزادیِ ارادہ سے اپنے جبلتی احساسات پر قابو پا رہا ہوتا ہے۔

قرآن میں ہیجانی کیفیات میں مبتلا شخصیت کا ”الانسان“ کے نام سے اُس کی صفات کے اظہار سے تعارف:

ہمیں قرآن سے رہنمائی ملتی ہے کہ انسان حیوان سے بتدریج ترقی کرتا ہوا، انسانی پیکر میں آیا ہے۔ جب انسان کا شعور خام تھا تو وہ اپنی جبلتوں سے مشتعل ہیجانات پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس کی وضاحت میں ارسطو کا قول ہے کہ انسانی بچپن کی زندگی اور حیوانی زندگی کی روح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ بچپن کی حالت میں جب جبلت کے احساسی پہلو پر مشتعل ہو کر ہیجان کے تابع چلے تو ایسے میں قرآن کی اصطلاح میں کہلائے جانے والے ”الانسان“ کی حالت جانوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے عقل سے قابو نہ پانے کی وجہ سے انسانی زندگی کے ہیجانی صفات میں مبتلا ہونے پر الانسان کی حالت کی یوں تصویر کشی کی ہے کہ:

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝ وَإِنَّهُ لَشِهِيدٌ ۝ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝ (8-6:100)

”انسان، ربوبیتِ خداوندی کا ناشکر گزار ہے۔ مال و دولت کی محبت اس پر غالب رہتی ہے۔ وہ سب کچھ اپنے ہی لیے

سمیٹ لینا چاہتا ہے۔“

جو لوگ علم الحق کی رہنمائی کے بغیر زندگی بسر کرتے ہیں، ایسے الانسان کو اپنی حالت پر بے باک چھوڑ دیا جائے، تو یہ سب کچھ اپنے لیے سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی الانسان کا لفظ آئے گا تو اس کے معانی ہیں، وہ خاص انسان یا قوم، جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے۔ یہاں اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر انسان کے سامنے وحی کی روشنی نہ ہو تو وہ ”کنود“ بن جاتا ہے۔ اس لفظ کے معانی ہیں، وہ جو سب کچھ اکیلا ہی کھا جائے اور دوسروں کو کچھ نہ دے۔ ایسی حیوانی زندگی گزارنے والے کی قرآن نے وضاحت کی ہے کہ:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ (2-1:104)

زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ الحق کی راہ نمائی کے بغیر زندگی بسر کرنے والے انسان، بلاشبہ ہمیشہ خسارے اور نقصان

ہی میں رہے ہیں۔

العصر سے پوری نوع انسانی کی تاریخ مراد ہوتی ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ ہر موجودہ دور کی تاریخ، اپنے ماضی کا نچوڑ ہوتا ہے۔ سارے قرآن میں سابقہ اقوام نوح، عاد و ثمود، مدین، لوط، بنی اسرائیل، فرعون وغیرہ کی تفصیل پھیلی ہوئی ہیں۔ اس آیت میں لفظ العصر سے سابقہ تباہ ہونے والی اقوام کی طرف اشارہ کر کے، ان کو شہادت میں پیش کرتا ہے کہ جن اقوام نے ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہیں کی تھی، تو وہ کیسے خسارے میں رہ کر تباہ و برباد ہو گئے۔ لہذا آئندہ بھی، جو اقوام ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گی، ان کا بھی وہی حشر ہوگا، جو گزشتہ اقوام کا ہو چکا ہے۔ قرآن میں اس خسارے کی زندگی میں انسان میں درج ذیل مزید صفات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ وہ

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (21:37)

”انسان کو جلد بازی پیدا کیا۔“

عجل سے ہی ہمارے ہاں عجلت کا لفظ ہے۔ ایک اور مقام یہ ہے

خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ (30:54)

”تمہیں کمزور پیدا کیا۔“

مِنْ عَجَلٍ اور مِنْ ضَعْفٍ کے یہ معانی نہیں کہ تمہیں جلد بازی اور کمزوری سے پیدا کیا ہے۔ ”مِنْ“ کہہ کر خدا نے انسان کی حیوانی جلد باز اور کمزور ہونے کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ حیوانی سطح پر انسان کی زندگی، وہی جبلتیں اپنے اندر رکھتی ہے، جو عام طور پر حیوانات کی ہوتی ہیں۔ حیوانات میں زندگی کا تحفظ 'Self Preservation' ایک بنیادی جبلتی تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کی رو سے، اس کی طبعی زندگی کا تحفظ اور سامان زیست وابستہ ہوتا ہے۔ اسے نہ چھوڑنے کی چاہت میں وہ آخرت اور انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس بنا پر وہ اپنی طبعی زندگی کے جبلتی تقاضوں پورا کرنے میں مصروف رہتے ہوئے اپنی پوری زندگی بسر کر دیتا ہے۔ قرآن وضاحت کرتا ہے کہ اس روش پر چلنے سے اُس کی زندگی میں درج ذیل صفات پیدا ہوتی ہیں۔

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ (17:11)

”انسان بھلائی کی بجائے ان چیزوں کو آواز دے دے کر بلاتا ہے جو اس کے لیے برائی کا موجب ہوں۔“

یہاں مزید تین صفات کا ذکر کر کے انسان کی حالتِ کنود کی وضاحت کر دی کہ:

وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا (17:67)

”انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔“

وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا (17:100)

”انسان بڑا تنگدل واقع ہوا ہے۔“

إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (33:72)

”یہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔“

یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَيَتَكَبَّرُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأُنْعَامُ (47:12)

”کفر کرنے والے لوگ بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اور جانوروں کی طرح کھاپی رہے ہیں۔“

قرآن کی سورہ المعارج میں ترتیب وار اسی انسان کی چار مزید صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَجَمَعَ فَأَوْعَى ۖ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۖ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝

(70:18-21)

وہ مال کو تھیلی میں رکھ کر جمع کرتا ہے پیدائشی طور پر تنگ دل اور بے صبر ہو جاتا ہے ذرا سی تکلیف پہنچے تو وادیا مچانا شروع کر دیتا ہے۔ جب مال ہاتھ آجائے تو کسی ضرورت مند کو نہیں دیتا۔

ان کے علاوہ سورہ الدھر میں مزید صفات کا ذکر ہے کہ:

إِنَّ هَؤُلَاءِ يُجِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ۝ (76:27)

”انسان پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لپکتا ہے۔ (عاقبت اندیشی سے کام نہیں لیتا) اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے

اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔“

الغرض کہ وہ:

أُولَٰئِكَ هُمُ الشَّرُّ الْبَرِيَّةِ (98:6) یہ لوگ تمام مخلوق سے بدتر ہیں۔

اسی لیے وہ:

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (18:54) ”بے شک انسان اکثر جھگڑے نکالتا رہتا ہے۔“

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَإِطْغَىٰ ۖ (96:6) ”یہ انسان بڑا ہی سرکش واقع ہوا ہے۔“

ان سب کی بنیادی وجہ یہی سامنے آتی ہے کہ یہاں انسان اپنی ذات کا ہی کا مُنکر ہوتا ہے اور اسی لیے قرآن اُسے

حیوان، بلکہ حیوان سے بھی بدتر زندگی گزارنے والا کے مقام پر رکھ رہا ہوتا ہے۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ اس جبلّی، لاشعوری اور

غیر ارادی میکائیک انداز حیوانیت کی روش سے ہٹ کر ماہر نفسیات، جبلّی، شعوری، ارادی اور انسانی اعمال کی بات کرتے ہیں۔

تو اسے انسان کے بطورِ عاقل حیوان احساسی وقوف کے ذہنی دائرے کی شکل میں سامنے لاتے ہیں۔ اسے قدرے تفصیل

سے بیان میں اس کی وضاحت انسانی ذات میں جسمانی و ذہنی کردار کے جائزہ سے لی جاتی ہے۔ (جاری ہے)

توحید باری تعالیٰ اور تصور آخرت

دنیا میں آنے والے ہر پیغمبر نے انسان کے رابطے کو کائنات سے استوار کرنے اور اسے محکم کرنے کی تعلیم دی اور اس کا ذریعہ توحید باری تعالیٰ اور تصور آخرت پر ایمان کو بتلایا، کہ اللہ تعالیٰ رفیق اعلیٰ ہے اور انسان رفیق ادنیٰ ہے اور اس رفاقت کا ثبوت تسخیر کائنات کر کے دیا جاسکتا ہے۔ انسان کے درمیان کاروبار کا ضابطہ کیا ہے؟ کاروبار کا ضابطہ میزان ہے یعنی ضابطہ ترازو ہے جس میں اشیاء کو رکھ کر تول جاتا ہے۔ انسان جب نظام تمدن میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس نے ترازو سے کام لینا شروع کر دیا تھا یعنی وہ دور جس میں انسان میزان کی اہمیت سے واقف ہو چکا تھا۔ قرآن انسان کا ضابطہ حیات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن انسان کی حیات کا میزان ہے یعنی ترازو ہے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ قرآن justice and quality کو پیش کرتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قرآن کی اپنی justice and quality کی بنیادیں ہیں اس کی اپنی میزان ہے اس کا اپنا ترازو ہے جس میں وہ justice

and quality کو تولتا ہے۔ اس طرح ترازو کے دونوں پلڑے برابر ہوتے ہیں؟ یہ فیصلہ انسان کی نگاہ پر نہیں چھوڑا گیا ہے یعنی انسان اپنے داخلی نظریہ کی بنیاد پر ایسا نہیں کر سکتا انسان کے اندر ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کی تصدیق قرآن نے کی ہو کہ اس کے ذریعے سے وہ یہ فیصلہ کرے کہ ترازو کے دونوں پلڑے صحیح ہیں یہ جسے انسان کا ضمیر یا انسانی عقل کہا جاتا ہے اس کا تعلق انسان کے داخلی معیار سے ہے۔ یہ اس کا اپنا ذاتی اندرونی معاملہ ہے اسے قرآن کی تعلیمات دوسرے انسان کے لئے معیار، قانون، سند، کا درجہ نہیں دیتی۔ قرآن دونوں پلڑوں کے برابر ہونے کے لئے ایک خارجی معیار دیتا ہے، جسے انسانی ضمیر یا انسانی عقل نہیں کہتے بلکہ وحی کہتے ہیں۔ انسانی ضمیر یا انسانی عقل کا تعلق انسان کے اپنے آپ سے ہے برعکس اس کے وحی کا تعلق خارج سے ہے جو نازل ہوتی ہے میزان کے دونوں پلڑے کیسے برابر ہوں گے؟ اس کے لئے قرآن کریم کی تعلیم ایک نظریہ دیتی ہے، جسے قرآنی و اسلامی نظریہ ideology یعنی ایمان

کائنات (ملائکہ) کے موجود ہونے کا اور انکے درمیان تعلق کا انکار کوئی نہیں کرتا کیوں کہ یہ کائنات کے اندر ہیں۔ ایمان کے ان تین شعبوں سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف کی شروعات ایمان کے دوستوں سے شروع ہوتی ہے، تصور خدا جو کائنات سے ماوراء یعنی خارج میں ہے کیونکہ وہ اس کائنات کی کوئی شے نہیں ہے یعنی وہ اس کائنات کے اندر نہیں ہے جسے انسان کھوج لگا کر ڈھونڈ لے گا وہ انسان کے حواس و ادراک سے بھی ماوراء ہے اسی طرح سے دوسرا ستون تصور آخرت کا ہے، یہ ہیں وہ خارجی معیارات جو وحی دیتی ہے، وحی وہ معیار و ضابطہ دیتی ہے، جسے انسان کی صلاحیتیں حاصل نہیں کر سکتیں، ایک انسان ہو یا انسانوں کا گروہ ہو وہ مل کر بھی قرآن کے معیار جیسا معیار و ضابطہ نہیں بنا سکتے ناممکن ہے، کیونکہ یہ ضابطہ یا معیار اس کائنات کے اندر کی کوئی شے نہیں ہے جو کوشش اور تسخیر کے ذریعے حاصل کی جاسکے، انسان اپنی زندگی گزارنے کا جس طرح سے چاہے ضابطہ بنا لے، یا اپنے معاشرے کو جس طرح کا چاہے نظام دے دے، اگر اس نظام کے اندر صحیح تصور خدا اور مرنے کے بعد کی زندگی یعنی آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے وہ نظام بالکل اور بالآخر ناکام و نامراد رہے گا اور اپنے مقصود و مطلوب کو حاصل نہیں کر سکے گا، جب ان دو تصورات پر انسان ایمان لے آتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ یہی صحیح راستہ ہے یعنی یہ صراطِ مستقیم ہے، تو پھر اس کے لیے رسالت، قرآن اور ملائکہ پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ توحید اور آخرت کا تصور رسالت، قرآن اور ملائکہ کے اندر ہی fitt in ہوتا ہے۔

کہتے ہیں۔ اسے زاویہ نگاہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نظریے کی عمارت کی بنیاد دوستوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ توحید اور آخرت، خدا کا صحیح تصور اور مرنے کے بعد کی زندگی کا صحیح تصور کیا ہے؟ ان بنیادوں پر کھڑی عمارت کی صرف ایک منزل ہے رسالت، کتاب (قرآن) اور ملائکہ (تصور کائنات)، رسول ایک بشر انسان ہوتا ہے وہ کائنات کو قرآن کی نظر سے دیکھتا ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم انفرادی قبائلی زندگی گزارتی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اجتماعی زندگی کی طرف لے کر آئے تھے قانون کی پاسداری کی تعلیم دی تھی انسان کو اس کے داخلی معیارات کی بجائے انہیں قرآن کا خارجی معیار دیا تھا، الگ الگ معیارات کی بجائے صرف ایک معیار دیا، جو انسان کے خارج میں تھا اور وہ کسی نوع انسانی میں سے کسی انسان کا دیا ہوا نہیں تھا، اسے تسخیر کائنات کرنا کہتے ہیں۔ تسخیر کائنات کا مطلب کائنات میں موجود قوانین کا علم حاصل کرنا ہوتا ہے کہ اشیائے کائنات کن قوانین کے تحت کام کرتی ہیں، ساری دنیا کے سائنسدان بالاتفاق جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ کائناتی قوانین کائنات نے از خود، خود ہی تخلیق نہیں کئے، اور ان قوانین کو جوڑے رکھنے والا جو ضابطہ ہے وہ اس کائنات کے اندر سے نہیں ہے بلکہ باہر سے ہے یہ جو باہر کی بات ہے یہ انسان کے ادراک سے ماوراء ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ڈوبنے والی چیز میرا پروردگار نہیں ہو سکتی۔ نوح علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی مثالیں بھی آپ کے سامنے ہیں۔ ایک بشر (انسان)، کتاب (قرآن میں موجود تعلیم) اور نظام

The Human Self and Allah

Episode No. 17

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

And when they achieve the life of Jannatas a result of *Eimaan* and righteous deeds, then there too *Rizq* will be bestowed by Allah.

It should be made clear that the people residing in that society which is shaped according to the laws of Allah live a life of Jannat both in this world and in the world of the hereafter too. We are aware of the *Rizq e Kareem* of this life, but we can say nothing about what the nature and state of this *Rizq* will be in the life of the hereafter. But this much is evident from this, that development of the human self will continue to take place in the life of the hereafter, the means and resources for which are termed as the *Rizq e Kareem* of that place.

7.9 Oppression and Tyranny

As has been noted above, the most vulnerable need of man is *Rizq*. In this world cruelty and tyranny, brutality and suppression continue only on this basis that powerful men take control of the means of *Rizq*, and after this get done whatever they want from human beings who are under their thumb. No human being is ready to become the slave of another human being willingly, no-one is agreeable to merrily and blithely put on the shackle of slavery from someone around his own neck. The enslavement of a human being is contrary to the eminence of humanity. But weak and feeble, helpless and beleaguered man becomes ready to accept all forms of enslavement when he is told that by not doing so the doors of *Rizq* will be closed to you. The *Azaab* of hunger is such a severe *Azaab* that in order to save himself from it a human being becomes obligated to accept every demand. Tyranny in the world starts from this very point and is kept propped up through this same force. Hence, in order to eradicate tyranny and subjugation from the world and to raise weak and feeble human beings to the level of humanity, it is essential that this erroneous belief is eliminated from their minds that the *Rizq* of another human being is in the hand of a man. And that this truth be unveiled to him that the sources of *Rizq* are open equally to the whole of the creation of Allah. Every individual has the right to take anything from these according to his need and aptitude. Hence, no human being needs to bow down before another man.

7.10 Slavery and Servitude

This is a humiliation for humanity that a human being should remain in the servitude of another human being merely for the sake of his daily bread. Since Pharaonic forces in the world have imposed this belief on the human mind with great intensity and tenacity that we are the masters of *Rizq*, this is why the Quran has, with equal intensity and reiteration, refuted this *Batil* belief, and in lieu has placed this correct *Eimaan* in man's

heart that *Rizq* is not in the hands of any human being – it is only in the Hand of Allah. But as has been stated already, by '*Rizq* being in the Hand of Allah', is meant that the means of sustenance should remain in the ownership of that society which distributes it according to the Divine laws. This is that reality which the Quran has explained by stating that the distribution of *Rizq* and its production and supply is according to the *Mashe'at* of Allah. In the human world the *Mashe'at* of Allah is carried out through the hands of those human beings who assume responsibility to implement His laws. Where the reins of power are not in the hands of these individuals (*Jamaat e Momineen*), the distribution of *Rizq* does not take place according to the laws of *Mashe'at*; it takes place according to the self-created laws and regulations of men, the consequence of which is an agonizing hell for humanity.

7.11 *Rizq* is in Allah's Hand

In light of these points all those verses of the Quran will be understood in which it is stated that the shortage and abundance of *Rizq* is in the natural control of Allah. No human being has been given the right to reduce or increase the *Rizq* of another human being. The Quran states:

...It is Allah that gives (you) want or plenty...(2:245)

Allah does enlarge, or grant by measure, the sustenance (which He gives) to whomsoever as per His will...(13:26) See also (17:30, 28:82, 29:62)

And this is that principle within which there are very great signs for those who possess *Eimaan* because:

See they not that Allah enlarges the provision and restricts it, to whomsoever He wills? Verily in that are signs for those who have *Eimaan*. (30:37)

Do they not ponder on this matter that Allah (according to His law of *Mashe'at*) makes sustenance abundant for the one who wishes, and gives to him who wishes according to a defined measure; in this (His law of *Mashe'at*) there are great signs for those who have *Eimaan*.

The keys of *Rizq* in the heavens and earth are only in His possession. He is indeed the Master of all the treasures of *Rizq*:

To Him belong the keys of the heavens and the earth: He enlarges and restricts the sustenance to whom He will: for He knows full well all things. (42:12)

The keys of the treasures of the heavens and earth are with Him. For the one who wishes, He provides more sustenance to him, and for the one who wishes, He gives him measured sustenance, and He has complete knowledge of all matters.

7.12 Evil Resulting from Intoxication of Wealth

We have noted above that when the distribution of sustenance does not take place according to the Divine laws, then the world becomes hell. What happens is that the means of sustenance fall into the hands of a small minority; this group becomes an evil model of arrogance and pride of Pharaonic forces, whose 'principle' is that that which is according to their desire is legitimate and rational, and whatever goes against their desire is evil and false. When this Pharaonic phantom rides the heads of this group, then they force the subjugated human being to prostrate in front of this claim of theirs:

(Pharaoh said to his people) 'I am your sustainer, most high'. (79:24)

These are those Pharaohs and Nimrods who, befuddled by the intoxication of their wealth, oppose every heavenly revolutionary invitation; because one injunction of the heavenly invitation is also this, that the means of sustenance be snatched away from human hands and should be placed in the control of the Divine laws so that the needs of life of every individual of humanity are fulfilled through these without any hesitation and effort, and continue thus through a balanced process. This is that reality towards which the Quran has drawn attention by stating:

Never did We send a warner to a population, but the wealthy ones among them said: 'We believe not in the (Message) with which you have been sent.' They said: 'We have more in wealth and in sons, and we cannot be punished.' Say: 'Verily my Sustainer enlarges and restricts the provision according to His law, but most men understand not.' (34:34-36)

And in whichever habitation We sent some messenger, the prosperous category of freeloaders there always stated this, that we refuse to accept these commandments which have been provided to you. They said that we are greater than you in both progeny and wealth and the punishment which you are warning us about can never grip us. (O Rasul) relate to them that your system in which the distribution of *Rizq* is according to your whims cannot continue here. The distribution of *Rizq* and its provision and restriction should be according to Allah's law of *Mashe'at*.

This very intoxication of indulgence in wealth gives rise to the desire in their hearts to dominate the earth and they wish that they could snatch the reins of the earth and draw them into their grasp, so that they could use the blood of the poor and exploit it for their hedonistic assemblies. Regarding the people of Saba, it is noted in the Quran that Allah

had granted them abundant *Rizq* and land but despite this their greed continued to multiply, and they would say:

...Our Sustainer, lengthen the distance between our journeys...(34:19)

When the condition reaches such a level, the throne of rebellion and arrogance is toppled in accordance with the immutable law of Allah, and such a system whose foundations are based on dominating the earth and on gluttonous blood sucking becomes the cause for its own destruction. After the glaring condition of the people of Saba, it is stated:

...so We made them as tales and dispersed them all in scattered fragments...(34:19)

So we made this nation a tale from the past. And they were scattered like grains of sand.

7.13 Consequences of Transgression

This same immense truth is narrated in the form of a simile in Surah *An-Nabl* in which it is stated that the people of a town used to spend their life in great peace and tranquility. Sustenance was plentiful and there were all kinds of comforts. After this they began to be ungrateful for the favours of Allah, the essential consequence of which was that the hell of hunger and fear engulfed them. After this it is stated:

Then eat of what Allah has provided for you (which is) lawful and good. And be grateful for the favour of Allah, if it is (indeed) Him that you obey. (16:114)

This means that if the system of a society is established according to the Divine laws then an abundance of sustenance prevails in it, and every individual lives a life of peace and tranquility. But if this system becomes shaped according to self-created human laws, then social imbalance is produced from this, whose consequence is nothing but destruction and ruin. This is why it is stated regarding the previous nations (people of the Book):

If only they had stood fast by the Law, the Gospel, and all the revelation that was sent to them from their Sustainer, they would have enjoyed happiness from every side... (5:66)

Contrary to this, spurning these principles becomes the cause for misery and humiliation for man:

But whosoever turns away from My Message, verily for him is a life narrowed down...
(20:124)

By having unwavering *Eimaan* in these Divine laws (the Quran) and acting tirelessly according to them, 'honourable sustenance' is availed:

Those who have Eimaan and work righteousness, for them is protection and a sustenance most honourable. (22:50)

In another verse it is stated that this 'honourable sustenance' is the natural consequence of their *Eimaan* and righteous deeds:

That He may reward those who have Eimaan and work deeds of righteousness: for such is protection and a sustenance most generous. (34:4)

7.14 Quest for Allah's *Fadl* (Blessings)

If efforts are made according to these laws for obtaining sustenance, then it is known as the 'quest for Allah's *Fadl*'. *Fadl* commonly means an increase, but in most places in the Quran it has been used to refer to economic conveniences (the chapter on *Fadl* itself will come later). Since these conveniences are bestowed by Allah without any effort or expectation, therefore it is called '*Fadl Ullah*'. But since these conveniences do not reach man automatically, it is necessary for man to desire and search for these and this is called the 'search for *Fadl Ullah*'. Regarding those who set out looking for this *Fadl Ullah*, the Quran has stated:

...others travelling through the land, seeking of Allah's bounty...(73:20)

In Surah *Al-Jumma* it is stated that, after finishing with *Salat*:

And when the Salat is finished, then may you disperse through the land, and seek of the bounty of Allah...(62:10)

It also states about the *Muhajireen*:

...to the indigent Muhajirs, those who were expelled from their homes and their property, while seeking Grace from Allah and (His) Good Pleasure...(59:8)

The same was stated about the *Jamaat* of the companions of Rasul-ullah:

...seeking Grace from Allah and (His) Good Pleasure...(48:29)

From these verses it is clear that although Allah's bestowed *Rizq* is present in the earth for the nourishment of mankind, in order to gain it desire, search, effort and struggle is

essential - without this no-one gets *Rizq*. Secondly, the meaning of this desire and quest does not mean that every individual (or group) should gather to himself whatever much *Rizq* he can and leave nothing for others. This is wrong – the correct system is that all members of society, according to their own individual ability and capacity, should exert themselves in gaining *Rizq*, and whatever is achieved (under a collective system), they should make it freely available for the nourishment of all individuals. In the terminology of the Quran this is called '*Infaaq Fi Sabeel Ullah*' which you will find emphasised in the Quran from the beginning till the end.

7.15 Making Available in the Cause of Allah

For example, if you turn over the first page of the Quran, the definition of *Muttaqeen* will appear first of all. Along with other attributes one of their glaring traits is stated as being:

...and keep open *Rizq* (for others) out of what We have provided for them. (2:3)

They keep the *Rizq* bestowed by Allah open to be spent in His cause. Along with this, read the following:

...Verily the most honoured of you in the sight of Allah is (he who is) the most righteous (Muttaqee) of you... (49:13)

From this it will become clear that in the view of Islam, in order to achieve honour and respect, it is necessary to keep available the outcome of our hard work in 'the cause of Allah'. In relation to '*Infaaq Fi Sabeel Ullah*', the following verses also require attention – (2:254, 3:179, 4:37-39, 9:74-76, 13:22, 14:31, 22:35, 28:54, 36:47, 63:10). By keeping these verses in view, the true meaning of this great verse will become apparent to you.

7.16 *Rizq* of all Living Things is the Responsibility of Allah

In one verse of the Quran it is stated:

There is no moving creature on earth, but its sustenance depends on Allah... (11:6)

It is said that if Allah is responsible for the *Rizq* of every living thing, then why does so much of creation die hungry. But while saying this, it is forgotten that the responsibility of Allah is only as long as you keep yourself under His established system. When you go out with His system and begin to consider yourself to be free from the protection of His system, then at that moment His responsibility will also be removed. Keep yourself within His system and then see how His 'responsibilities' are fulfilled. Imposing a Pharaonic system devised by men over ourselves, and then expecting those outcomes which are specific to the Divine system, if this is not blatant ignorance, then what else is it? What can the outcome be of the one who takes shelter under a ramshackle building during an earthquake other than destruction. If he comes under the impregnable roof of Allah, then see if Allah assumes responsibility for his protection or not:

...whoever rejects evil and has Eimaan in Allah has grasped the most trustworthy handhold, that never breaks... (2:256)

This 'dependable support' is that Divine system, after which no need remains for any other support. When the system of Allah was established on this earth, at that time the people had come to understand what the correct meaning is of the verse (11:6). An official from Kufa (a town in Iraq) once came to Medina and found that the Caliph Umer was eating bread made from barley. He said, what, can the leader of the *Momineen* of such a grand state not even consume bread made from wheat? The reply received was that Umer can only eat bread made from wheat when he is sure that every human being within the boundaries of his Caliphate has bread made from wheat available to him. Until this fact is established with certainty, how can Umer consume bread made from wheat? Now just consider, can any human being remain hungry in such a system of government? The commencement of Quranic teaching is with these very words, *Alhamdo Lillab e Rabb-il-Alameen* i.e. all kinds of *Hamds* for that Allah Who is *Rabb-il-Alameen* – His attribute of *Mahmoodiat* is because He is *Rabb-il-Alameen*; He is the Nourisher and Sustainer of the whole of the universe. Hence, the *Mahmoodiat* of the nation in this world which will be responsible for the establishment of that government, will also be due to its attribute of *Rabubiyat*. It will be deserving of admiration at that point when it arranges for the nourishment of all those people who have come under the canopy of the Divine system; and the arrangement to also be such that, just as their Allah has proclaimed about Himself:

I do not want from them any Rizq... (51:57)

Similarly, those people in whose hands is the control of the administration and organisation of this society, they should not extract material for their own luxury and comfort from the toil of their 'people', instead they should be concerned about their *Rabubiyat*. Since I have provided details of this system in my book, *The Quranic System of Sustenance*, in great depth, hence, at this point these explanations are considered sufficient.

7.17 Hunger and Poverty are Allah's *Azaab*

At this juncture it is important to reiterate that hunger and poverty are Allah's *Azaab* (punishment). In Surah *An-Nabl* it is quoted as an example that when a population became ungrateful for the favours of Allah, then as a recompense of this crime:

...So Allah made it taste of hunger and fear like a garment for what they had been doing.
(16:112)

In other words, fear and hunger is a chastisement from Allah and to remain secure from these things is His blessing. The Quran states:

...Who provides with food against hunger, and with security against fear. (106:4)

This punishment visits that nation which engages in rebellion against His laws. Its beginning arises from the powerful echelon at the top, and the subjugated category (the poor and the general public) becomes criminal for the crime of accepting this Pharaonic system; hence, just as in the higher echelon the fire of absence of tranquility and disappearance of peace is ignited, Allah's *Azaab* takes the shape of the curse of hunger and poverty in the lower class. But, unfortunately, for some time this belief has become embedded in our minds that the life of poverty and destitution, helplessness and feebleness, dependence and deprivation is the life of those who are closer to Allah – this is the sign of those servants who are closer to Him. These beliefs are the consequence of the continuous propaganda of the creation of the *Ajmi* philosophy of life and of 'Christ's preachers', who desire to keep Muslims entrenched in this deception that the 'kingdom of heaven' can only be acquired by the one who is the weakest and most subjugated in the land. We have been locked in this deception of monasticism for a long time and do not understand that deprivation and poverty are an *Azaab* of Allah, not a mercy. The natural consequence of *Eimaan* and righteous deeds is power in the land and honourable sustenance. The mark of true *Momineen* is this:

Such in truth are Momineen: they have grades of dignity with their Sustainer and protection, and honoured sustenance. (8:4)

From the above explanations you will have seen that *Razzaqiyyat* is an attribute of Allah. In the external universe the manifestation of this attribute occurs automatically but in the human world its *modus operandi* changes. In this, though the means of sustenance are available from Allah free of charge, firstly desire and effort has to be made for the attainment of *Rizq*, and secondly the distribution of *Rizq* has to be carried out according to the Divine laws. All this can only be done by that *Jamaat* whose members manifest this attribute in their selves. It is obvious that when the economic system is in the hands of this kind of *Jamaat*, then how contented mankind will be from the point of view of the provision of *Rizq*. The fact is that the world has not yet been able to even reach that level from where it could see this reality clearly unveiled before it, how the external revolution following on from the 'revolution within the consciousness' causes this earthly being to become such a being who is worthy of heaven. Currently the world wishes to solve the difficulties of its *Rizq* by employing mechanical techniques such as communism which can never succeed. Once it has seen these techniques and procedures through to the end, then after that it will turn in the direction of the Quranic treatment, and the alleviation of its suffering will also be at that very time. To take 'Allah' out of your world and to then desire for peace - such a thought is impossible and is that of the insane.

8 *Rehmat* (Mercy)

The basic meaning of *Rehmi* is gentleness and kindness. (*Rehmun*: the uterus of a woman within which the fetus develops and remains protected from external effects). The meanings of *Rehmat* are that gift which fulfills the apparent and hidden needs of someone, and in this way his nourishment takes place just as the fetus is nourished in the womb of a mother. From this respect Allah's *Rehmat* is also another link in the attributes of *Rabubiyat* and *Razzaqiyat*, with this difference that the aspect of gentleness is predominant in this. It also means to cover something and to ensure the provision of the means of protection. When the word *Rehmat* or *Rehmi* is used in mutual relations then its meaning will also be of love, nearness and affection. For example, where it is emphasised that parents should be treated with kindness and compassion, this is referred to as *Rehmat*:

And, out of kindness, lower to them the wing of humility (*Rehmat*)...(17:24)

Where relations between husband and wife are mentioned, this *Rehmat* includes the sentiments of love combined with kind-heartedness:

And among His signs is this, that He created for you mates from among yourselves, that you may dwell in tranquility with them, and He has put love and *Rehmat* (mercy) between your (hearts): verily in that are signs for those who reflect. (30:21)

Allah also uses the word *Rehmat* for generous provision and economic prosperity (17:28).

8.1 Allah is *Rabeem*

The way in which Allah's attribute of *Rabubiyat* has been mentioned with intensity and reiteration in the Quran, similarly His attribute of *Rehmat* has also been mentioned repeatedly. The beginning of its every verse is with the name of Allah, Who is *Rehman* and *Rabeem*. At some places that Allah is *Rabeem* and *Wadood*, at other places *Rauf-ur-Rabeem*, *Tawwab-ur-Rabeem*, *Ghafoor-ur-Rabeem*, *Aziz-ur-Rabeem* and *Birr-ur-Rabeem*. In the Quran such names of Allah have appeared at least one hundred fifty times in which *Rehman* and *Rabeem* are present. Other places at which *Rehmat* is mentioned are over and above these. In Christianity too, God has been called *Rabeem*, but there He is mercy alone (God is Mercy), nothing other than this. But in the Quran *Rehm* is only one facet of the attributes of Allah. Apart from this He has other attributes as well. Indeed, the concept of Allah in the Quran is so complete that after this God, there remains no need for another 'god'. Contrary to this, the consequence of the limited concept of God in

Christianity was this, that Europe had to search for other 'gods' for administration, organisation and justice, and since these gods were carved by the human mind, therefore on lifting the curtain it was learned that these are responsible for 'persistent conflicts and bloodshed'. If Europe had somehow found the 'Allah of the Quran' then its state today would have been something else.

8.2 *Rehman and Raheem*

In relation to Allah's attribute of *Rehmat*, the words *Rehman* and *Raheem* have been used many times; though the root of both these words is the same, from the point of view of the rules of lexicon there is an extremely refined distinction between them. *Raheem* means he whose *Rehmat* remains compulsorily operational continuously and according to a specific pattern and procedure. And *Rehman* means the one whose *Rehmat* manifests swiftly with great intensity. In order to understand this difference, it is necessary to examine the law of evolution of the universe. The law of evolution informs us that the things of the universe, while developing and evolving according to a particular pattern and process, reach their completion. But sometimes it also happens that such a rapid revolution emerges in a certain thing that by skipping over many links of evolution, it suddenly becomes something else from what it was. This is known as Emergent Evolution in terminology. The general nourishment of the universe takes place according to Allah's attribute of *Raheemiyat* and this sudden or Emergent Evolution according to His attribute of *Rehmaniyat*. This is the reason why the Quran has noted the attributes of *Rehman* and *Raheem* as being separate entities, though the meaning of both are related to the provider of the means of sustenance and sources of protection with kindness and compassion.

This should also remain clear that the term *Rehman* is only applicable to the Being of Allah, whereas in *Raheem* other 'providers of *Rehmat*' can also be included, for example it was stated about Rasul-ullah that he is *Rauf-un-Raheem* (9:128).

8.3 Wondrous Displays of Allah's *Rehmat* in the Universe

The requirement of Allah's *Rehmat* was that when man was sent to this world, the means for his physical sustenance should be made available automatically. The first and foremost dependence of man's life is on air (as has been already mentioned). Allah has dispersed this around planet earth in such a fashion that wherever man goes air is around him and the process of its inward and outward flow in man is set in such a way that man, engaged in carrying out all sorts of worldly tasks, does not even notice how the respiratory process is continuously functioning automatically (without his intent and effort). Along with air, the arrangement for light also exists on the same pattern. After light, let us look at water. It has been placed everywhere flowing and protected in such a

way that no other water supply system in the world can compete with it. After this the question of *Rizq* arises. So, for man's need the process of produce from the land is operating with such order and organisation, that there was no power in any machinery that could make it operate in this way. In the Divine distribution of these things there is no distinction between higher and lower, small or great. It never happens that the first ray of the sun strikes the palace of a Brahmin and the last and fading rays reach the hut of that of a *Shudra* (a lower caste); that the heavy and effective drops of rain pour down on the fields of a *Jagirdar* and the 'sparse and ineffective' portion on the land of a peasant. All this is received through His *Rehmat* and received without any charge or recompense. Allah has declared these favours as His Own *Rehmat*. The Quran states:

Then contemplate the effects of Allah's *Rehmat*! how He gives life to the earth after its death. Undoubtedly, He is going to give life to the dead... (30:50)

In another verse it is stated:

Among His Signs is this, that He sends the winds, as heralds of glad tidings, giving you a taste of His *Rehmat* (Mercy), that the ships may sail by His command and that you may seek of His Bounty: in order that you may be grateful. (30:46) See also (7:57)

Only He can do all this, other than Him, no-one else:

Who guides you through the depths of darkness on land and sea, and Who sends the winds as heralds of glad tidings, going before His Mercy? (Can there be another) god besides Allah? High is Allah above what they associate with Him! (27:63)

The splashes of His bountiful rain pour down at that time when man is completely despairing about the earth reviving to a fresh life:

He is the One that sends down rain (even) after (men) have given up all hope and scatters His *Rehmat* (far and wide). And He is the Protector, Worthy of all Hamd. (42:28)

For human development, division of day and night was also absolutely necessary, the day to seek a livelihood and the night for the sake of peace; this is also attributed to Allah's *Rehmat*:

It is out of His *Rehmat* that He has made for you Night and Day, that you may rest therein, and that you may seek of his Grace; and in order that you may be grateful. (28:73)

8.4 Continuity of Divine Guidance is Allah's *Rehmat*

This was the arrangement for man's physical needs. As far as this part is concerned, animals and man are both equal. But man is not defined by his body alone and his needs are not only physical needs. There is within him another thing other than his body, which is called the human self - and this is that thing which is the reason for his eminence as a human being. Hence, for man the need for the development of his self is also inseparably linked with his physical nourishment.

Development of the human self takes place via that heavenly guidance which is called

Wabi. Alongside the example of rain, the Quran has also noted this heavenly guidance (30:41-53), and in this respect Rasul-ullah is declared to be a *Rehmat* for mankind from Allah:

We sent you not, but as a *Rehmat* for all times. (21:107)

8.5 Who is the *Rehmat* of Messenger-hood for?

But just as the blessing of rain can only be profitable to that land which opens up its breast to absorb the drops of *Rehmat*, and is ready to accept its effect, even if heavily laden clouds came a thousand times on barren land, no fragrant grasses or scented herbs will be produced. Similarly, messenger-hood can only be a sign of *Rehmat* for those who are willing to be influenced by this *Rehmat*. The name of this 'acceptance' is *Eimaan*. Hence, it is stated that though it is true that the messenger is *Rehmat* for all times, but:

... this *Rehmat* is for those of you, who accept *Eimaan*... (9:61)

This is because, as stated in verses (30:48-53), neither can the message be made to be heard by the dead and deaf, nor can the path be made visible to the blind. By dead, deaf and blind people is meant those people about whom it is stated in another verse:

... They have hearts wherewith they understand not, eyes wherewith they see not, and ears wherewith they hear not. They are like cattle, nay more misguided: for they are heedless. (7:179)

8.6 Messenger-hood is also *Rehmat* for *Nabi* Himself

This was the relationship of messenger-hood to other human beings but for a *Nabi* to receive messenger-hood himself is also due to *Rehmat* from Allah (11:28, 11:63). But no one receives this *Rehmat* of Allah through his own effort and skill, no human being can become a *Nabi* through his own efforts. Before Rasul-ullah himself received messenger-hood, he had no inkling of this matter that he was going to be selected for this great responsibility (28:86). In another verse it is stated that if Allah had wished, even after revealing the Quran He could have removed it, but it was due to His *Rehmat* that He did not do this (17:86-87).

The decision as to who will be selected for this *Rehmat* of Allah (i.e. messenger-hood) was made under the *Mashe'at* of Allah:

... But Allah will specially choose for His *Rehmat* whom He will - for Allah is greatest possessor of *Fadl*. (2:105) See also (3:74, 19:50)

- 4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔
 - 5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔
 - 6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔
 - 7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔
 - 8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔
 - 9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔
- (3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

- 1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سمائی چلی جائیں۔
- 2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط و ضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔
- 3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔
- 4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقت انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔
- 5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔
- 6- جو ہمیں احکام دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL^R AND QUAID-E-AZAM^R

CPL.NO. 28

VOL.76

ISSUE

06

Monthly TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan

Phone. 042-35714546, 042-35753666

E-mail: idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org

www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿٩٦﴾ (3:96)

ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قرآن نے بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو کیوں مرکز قرار دیا ہے؟ (2:142)۔
ان سے کہو کہ دنیا میں سب سے پہلے جس مقام کو نوع انسان کا مرکز تجویز کیا گیا تھا وہ مکہ تھا۔ اسی مرکز سے اقوام
عالم کو شہادت و استحکام اور نشوونما کا سامان ملتا تھا اور اسی کو وہ روشنی کا مینار بننا تھا جس سے عالمگیر انسانیت کے
سامنے زندگی کا صحیح راستہ آ سکے۔ (مفہوم القرآن از علامہ پرویز)

